سورۃ التوبۃ کے ابتدائی حصے کا زمانۂ نزول اور تاریخی پس منظر: داخلی و خارجی شہادتوں کی روشنی میں تحقیقی تجزیہ

محمد مشتاق احمد ہ

تمہید

عصر حاضر میں اسلامی بین الاقوامی قانون پر کام کرنے والے بیشتر غیر مسلم مصنفین اس نظریے کے قائل ہیں کہ اسلامی قانون کی رو سے مسلمانوں غیر مسلموں کے ساتھ مستقل طور پر حالتِ جنگ میں ہیں اور یہ حالتِ جنگ تبھی ختم ہو گی جب یا تو تمام غیر مسلم اسلام قبول کر لیں، یا وہ کم از کم مسلمانوں کے زیر تسلط زندگی بسر کرنے پر آمادہ ہو جائیں۔ [۱] مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان مستقل حالتِ جنگ کے قائلین میں کئی نامور مسلمان اہلِ علم بھی شامل ہیں۔ [۲] اس نظریے کے لیے عام طور پر سورۃ التوبۃ کی آیات سے استدلال کیا جاتا ہے جن

ہ اسسٹنٹ پروفیسر، شعبۂ قانون، بین الاقوامی اسلامی یونی ورسٹی، اسلام آباد، رکن مجلسِ ادارت موسوعۃ القرآن المتکاملۃ (*The Integrated Encyclopedia of the Qur'an*) ۔ (mushtaqahmad@iiu.edu.pk)

مصنف جناب محمد عمار خان ناصر، جناب احمد خالد حاتم، محترمہ سعدیہ تبسم اور جناب محمد عامر عزیز انصاری کا شکر گزار ہے جنھوں نے اس مقالے کے ابتدائی مسودے پر تفصیلی تنقید کر کے اس کی خامیاں دور کرنے میں مدد دی۔

۱۔ مشہور عراقی مسیحی عالم مجید خدوری (م ۲۰۰۷ء) نے، جن کا کام بعد میں آنے والے تقریباً تمام مغربی مصنفین کے لیے بنیادی ماخذ کی حیثیت رکھتا ہے، یہی نظریہ پیش کیا ہے:

Majid Khadduri, *The Islamic Law of Nations: Shaybani's Siyar* (Baltimore: John Hopkins, 1966), 10ff.

۲۔ مثال کے طور پر مولانا سید ابو الاعلی مودودی (م ۱۹۷۹ء) کا "مصلحانہ جہاد" کا تصور یہ ہے کہ جہاد کے ذریعے دنیا سے "فتنہ" و "فساد" کا خاتمہ کیا جائے اور چوں کہ کافرانہ حکومت ہی فتنہ و فساد کی بنیاد ہے، اس لیے کافرانہ حکومتوں کے خاتمے تک جہاد کا یہ سلسلہ جاری رہے گا۔ (سید ابو الاعلی مودودی، **الجہاد فی الاسلام** (لاہور: ادارۂ ترجمان القرآن، ۱۹۷۴ء)، ۱۱۷-۱۱۸۔) اسی طرح ڈاکٹر محمد حمید اللہ (م ۲۰۰۲ء) اس بات کے قائل ہیں کہ اسلامی قانون کی رو سے جائز جنگوں کی ایک قسم "نظریے کی خاطر لڑی جانے والی جنگ" (Idealistic War) ہے، یعنی وہ جنگ جو "کفر اور شرک کی بیخ کنی" کے لیے لڑی جائے۔ وہ اس بات کے قائل ہیں کہ کسی کو اسلام قبول کرنے پر مجبور نہیں کیا جائے گا، لیکن اسلامی حکومت "ہر ممکن طریقے سے" قائم کی جائے گی۔

میں مسلمانوں کو حکم دیا گیا ہے کہ مشرکین کے ساتھ اس وقت تک لڑیں جب تک وہ اسلام قبول نہ کر لیں اور اہلِ کتاب کے ساتھ اس وقت تک لڑیں جب تک وہ جزیہ دینے پر آمادہ نہ ہوں۔[۳]

کئی مسلمان اہلِ علم نے اس نظریے کی ابطال کے لیے یہ دلیل دی ہے کہ سورۃ التوبۃ کی آیات میں مذکور حکم مطلق ہے جسے قرآن کریم کی دیگر کئی آیات، جیسے سورۃ البقرۃ کی آیت ۱۹۰، نے مقید کیا ہوا ہے۔[۴] تاہم ہمارے نزدیک یہ دلیل زیادہ مضبوط بنیادوں پر قائم نہیں ہے۔[۵] اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ سورۃ التوبۃ کی آیات کا نزول آخری دور میں ہوا ہے، اسی لیے اگر ان کا دیگر آیات کے ساتھ تعارض ہے تو سورۃ التوبۃ کی آیات کو ناسخ مانا جائے گا، اور یہی رائے بالعموم فقہا نے قائم کی ہے۔[۶]

Muhammad Hamidullah, *The Muslim Conduct of State* (Lahore: Sheikh Muhammad Ashraf, 1945), 157.

۳۔ القرآن، ۹: ۵، ۲۹۔ نیز اس نظریے کے لیے عام طور پر اس بات سے بھی استدلال کیا جاتا ہے کہ فقہاے اسلام نے دنیا کو دو حصوں، دار الاسلام اور دار الحرب میں تقسیم کیا تھا۔ (*The Islamic Law of Nations*, 12) ہم ایک دوسرے مقام پر تفصیل سے واضح کر چکے ہیں کہ دار الاسلام اور دار الحرب کی تقسیم کا مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان مستقل حالتِ جنگ کے نظریے کے ساتھ کوئی براہ راست تعلق نہیں ہے اور یہ کہ اس نظریے کی بنیاد دراصل سورۃ التوبہ کی آیات کی ایک مخصوص تاویل سے ہے۔ دیکھیے:

"The Notions of Dar al-Harb and Dar al-Islam in Islamic Law with Special Reference to the Hanafi Jurisprudence", *Islamic Studies*, 47: 1 (2008), 5-37.

۴۔ پروفیسر ڈاکٹر محمد منیر، جو شریعہ اکیڈمی اسلام آباد کے ڈائریکٹر ہیں اور اسلام کا قانون بین الاقوام ان کی تحقیقی کاوشوں کا خاص موضوع ہے، اسی رائے کے قائل ہیں۔ تفصیل کے لیے دیکھیے ان کا مقالہ:

"Public International Law and Islamic International Law: Identical Expressions of World Order," *Islamabad Law Review*, 1: 3-4 (2003), 369-431.

۵۔ اس رائے کے تنقیدی جائزے کے لیے دیکھیے: "The Notions of Dar al-Harb and Dar al-Islam", ۲۷-۲۸۔

۶۔ عصر حاضر میں اسلامی بین الاقوامی قانون پر کام کرنے والے بیشتر غیر مسلم مصنفین اس نظریے کے قائل ہیں کہ اسلامی قانون کی رو سے مسلمانوں غیر مسلموں کے ساتھ مستقل طور پر حالتِ جنگ میں ہیں اور یہ حالتِ جنگ تبھی ختم ہو گی جب یا تو تمام غیر مسلم اسلام قبول کر لیں، یا وہ کم از کم مسلمانوں کے زیر تسلط زندگی بسر کرنے پر آمادہ ہو جائیں۔ اس نظریے کے قائلین میں کئی نام ور مسلمان اہلِ علم بھی شامل ہیں اور اس کے لیے عام طور پر سورۃ التوبہ کی ان آیات سے استدلال کیا جاتا ہے جن میں مسلمانوں کو حکم دیا گیا ہے کہ مشرکین کے ساتھ اس وقت تک لڑیں جب تک وہ اسلام قبول نہ کر لیں اور اہلِ

احکامِ جہاد کے فہم کے لیے سورۃ التوبۃ کی آیات کی اہمیت مسلم ہے۔ یہ بھی تسلیم شدہ ہے کہ ان آیات کی صحیح تاویل کے لیے اس مخصوص ماحول کو سمجھنا ضروری ہے جس میں ان کا نزول ہوا، تاہم چوں کہ قرآن کریم کی آیات کا نزول مختلف مواقع پر ہوا ہے اور پھر یہ آیات مختلف سورتوں کے اندر مخصوص مقامات پر رکھی گئی ہیں، اس لیے زمانۂ نزول اور تاریخی پس منظر کے تعین کے لیے ایک جانب شانِ نزول کی روایات ہوتی ہیں اور دوسری جانب مخصوص سورت میں ان آیات کا خاص سیاق و سباق ہوتا ہے جن میں بعض اوقات تطبیق نہایت مشکل ہو جاتی ہے۔ یہ مسئلہ سورۃ التوبۃ کے ابتدائی حصے کے زمانۂ نزول کی تحقیق میں واضح طور پر سامنے آتا ہے۔

موضوع اور مضامین کے لحاظ سے دیکھا جائے تو سورۃ التوبۃ کے دو بڑے حصے ہیں: آیات ۱ تا ۳۷ میں مشرکین عرب اور اہلِ کتاب سے براءت کا اعلان کرنے کے بعد ان کے متعلق آخری احکام دیے گئے ہیں۔ آیات ۳۸ تا اختتامِ سورۃ منافقین کے مختلف گروہوں کا تفصیلی تعاقب کر کے ان کے متعلق آخری احکام دیے گئے ہیں اور ساتھ ہی مومنین کے مختلف گروہوں کے لیے اللہ تعالیٰ کی جانب سے فیصلے کا اعلان کیا گیا ہے۔ تاہم زمانۂ نزول کے اعتبار سے مفسرین نے بالعموم ان آیات کو تین حصوں میں منقسم مانا ہے۔ اس عمومی رائے کی توضیح مولانا مودودی رحمۃ اللہ علیہ ان الفاظ میں کرتے ہیں:

> پہلی تقریر آغاز سورہ سے پانچویں رکوع کے آخر [آیت ۳۷] تک چلتی ہے۔ اس کا زمانۂ نزول ذی القعدہ ۹ھ یا اس کے لگ بھگ ہے۔۔۔ دوسری تقریر رکوع ۶ کی ابتدا [آیت ۳۸] سے رکوع ۹ کے اختتام [آیت ۷۲] تک چلتی ہے اور یہ رجب ۹ھ یا اس سے کچھ پہلے نازل ہوئی جب کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم غزوۂ تبوک کی تیاری کر رہے تھے۔۔۔ تیسری تقریر رکوع ۱۰ [آیت ۷۳] سے شروع ہو کر سورۃ کے ساتھ ختم ہوتی ہے اور یہ غزوۂ تبوک سے واپسی پر نازل ہوئی۔ اس میں متعدد ٹکڑے ایسے بھی ہیں جو مختلف ایام میں مختلف مواقع پر اترے اور بعد میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اشارۂ الٰہی سے ان کو یکجا کر کے ایک سلسلۂ تقریر میں منسلک کر دیا۔ مگر چوں کہ وہ ایک ہی مضمون اور ایک ہی سلسلۂ واقعات سے متعلق ہیں اس لیے ربط تقریر میں کہیں خلل نہیں پایا جاتا۔ (۷)

کتاب کے ساتھ اس وقت تک لڑیں جب تک وہ جزیہ دینے پر آمادہ نہ ہوں۔ بعض مسلمان اہلِ علم نے اس نظریے کے ابطال کے لیے یہ دلیل دی ہے کہ سورۃ التوبہ کی آیات میں مذکور حکم مطلق ہے جب کہ یہی حکم قرآن کریم کی دیگر کئی آیات میں مقید ہے اس لیے یہاں بھی اس مطلق حکم کو مقید محمول کیا جائے گا۔ تاہم فقہانے بالعموم سورۃ التوبہ کی آیات کو دیگر آیات کے لیے ناسخ مانا ہے۔ مثال کے طور پر دیکھیے: ابو بکر احمد الجصاص الرازی، **أحكام القرآن**، تحقیق محمد الصادق قمحاوی (بیروت: دار إحياء التراث العربي، ۱۴۱۲ھ / ۱۹۹۲ء)، ۴: ۲۶۹-۲۷۰۔

۷۔ سید ابو الاعلیٰ مودودی، **تفہیم القرآن** (لاہور: ادارۂ ترجمان القرآن، ۱۹۷۴)، ۲: ۱۶۶۔

زیر نظر مقالے میں سورۃ التوبۃ کے ابتدائی حصے (آیات ۱ تا ۲۸) کی داخلی اور خارجی شہادتوں کی روشنی میں مختلف آیات کے نزول کا زمانہ اور اس وقت کے حالات متعین کرنے کی کوشش کی جائے گی کیوں کہ اس پس منظر کو سمجھے بغیر ان آیات کی صحیح تفہیم ممکن نہیں ہے۔

سورت کا یہ حصہ موضوع کے لحاظ سے تین ذیلی حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

۱ تا ۲۸ میں مشرکین عرب سے اعلان براءت کیا گیا ہے۔

آیات ۲۹ تا ۳۵ میں اہل کتاب سے براءت کا اعلان کیا گیا ہے۔

آیات ۳۶-۳۷ میں مشرکین سے براءت کے متعلق تکمیلی احکام دیے گئے ہیں۔ یہ دو آیات گویا اس حصے کے آخر میں ضمیمے کی حیثیت رکھتی ہیں۔

زیر نظر مقالے میں اہلِ کتاب سے متعلق براءت کی آیات پر بحث نہیں کی جائے گی، بلکہ صرف مشرکینِ عرب سے براءت کے متعلق آیات کے زمانۂ نزول کی تحقیق کی جائے گی۔

جیسا کہ ذکر کیا گیا، آیات کے اس مجموعے کے زمانۂ نزول کے متعلق مفسرین نے عام طور پر یہ رائے قائم کی ہے کہ سورت کا یہ حصہ ایک ہی موقع پر نازل ہوا ہے۔ مولانا امین احسن اصلاحی (م ۱۹۹۷ء) نے یہ دل چسپ رائے اختیار کی ہے کہ سورت کے ابتدائی حصے کا نزول معاہدۂ حدیبیہ کے نقض اور فتحِ مکہ سے قبل ہوا ہے، لیکن صرف اس کا اعلان ۹ھ کے حج کے موقع پر کیا گیا۔ مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ (م ۱۹۴۵ء) کی رائے یہ ہے کہ یہ آیات مختلف ٹکڑوں میں نازل ہوئی ہیں۔ یہاں ان تینوں نظریات کا تفصیلی جائزہ لیا جائے گا اور اس کے لیے قدیم تفسیری مواد کے علاوہ سیرت و تاریخ اور فقہ کے ذخیرے سے استفادہ کیا جائے گا۔ جہاں تک ان آیات سے متعلق فقہی مباحث کے تجزیے کا تعلق ہے وہ ایک الگ مقالے میں پیش کیا جائے گا۔

فصلِ اول: جمہور مفسرین کی رائے کا تنقیدی جائزہ

آیات کی اندرونی شہادتوں کی وجہ سے جمہور مفسرین کی رائے پر کئی قوی اشکالات عائد ہوتے ہیں[۸] جن میں چند یہاں ذکر کیے جاتے ہیں۔ آیات ۷ تا ۱۲ کے مطابق ابھی قریش کے ساتھ معاہدہ برقرار تھا۔ اس کے لیے درج ذیل آیات کی اندرونی شہادتوں پر غور کریں۔

۸- جمہور مفسرین کی اس رائے کے لیے مثال کے طور پر دیکھیے: ابو جعفر محمد بن جریر الطبری، **جامع البیان عن تأویل آي القرآن**، تحقیق محمود محمد شاکر (قاہرہ: مکتبۃ ابن تیمیۃ، تاریخ ندارد)، ۱۴: ۹۵ ومابعد؛ ابو عبد اللہ محمد بن احمد الانصاری

اولاً: آیت ۷ میں ارشاد باری تعالیٰ ہے: M ! " # $ % & 6 4 3 2 1 0 . - , + *) (' L 9 8 7 (ان مشرکین کے لیے اللہ اور اس کے رسول کے نزدیک کوئی عہد آخر کیسے ہو سکتا ہے، بہ جز ان لوگوں کے جن سے تم نے مسجد حرام کے پاس معاہدہ کیا تھا، تو جب تک وہ تمھارے ساتھ سیدھے رہیں تم بھی ان کے ساتھ سیدھے رہو کیوں کہ اللہ متقیوں کو پسند کرتا ہے۔)

اس آیت میں ﴿ * + , - ﴾ کے الفاظ سے اشارہ بہ ظاہر قریش کی طرف ہے اور ﴿ 0 1 2 3 4 ﴾ کے الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس آیت کے نزول کے وقت ابھی قریش نے معاہدۂ حدیبیہ کی خلاف ورزی نہیں تھی۔[۹]

ثانیاً: آیت ۱۲ سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس کے نزول کے وقت معاہدۂ حدیبیہ بر قرار تھا گو کہ امکان پیدا ہو گیا تھا کہ مشرکین کسی بھی وقت اسے توڑ سکتے ہیں: M w x y z { | وَطَعَنُواْ فِي دِينِكُمۡ فَقَٰتِلُوٓاْ أَئِمَّةَ ٱلۡكُفۡرِ ¥ § ¨ © ª L (اور اگر یہ عہد کر چکنے کے بعد اپنی قسمیں توڑ دیں اور تمھارے دین پر حملے کریں تو تم کفر کے ان پیشواؤں سے لڑو کیوں کہ ان کی قسموں کا کوئی اعتبار نہیں تا کہ یہ باز آجائیں۔)

القرطبی، **الجامع لأحكام القرآن** (بیروت: مؤسسة الرسالة، ۲۰۰۶ء)، ۱۰: ۹۷ ومابعد؛ ابو الفضل شہاب الدین السید محمود الآلوسی، **روح المعاني في تفسير القرآن العظيم و السبع المثاني** (بیروت: دار إحياء التراث العربي، تاریخ ندارد)، ۱۰: ۴۴ ومابعد۔

۹۔ سال ذوالقعدہ ۶ھ میں رسول اللہ ﷺ تیرہ سو کے لگ بھگ صحابہ کو ساتھ لے کر عمرے کے لیے مکہ روانہ ہوئے۔ قریش نے صدیوں سے تسلیم شدہ زیارت بیت اللہ کے حق کی پامالی کرتے ہوئے مسلمانوں کی راہ روکنے کی کوشش کی۔ رسول اللہ ﷺ نے راستہ تبدیل کر لیا اور قریش کے خبر دار ہونے سے پہلے ہی مکہ کے دامن تک پہنچ گئے۔ حدیبیہ میں آپ نے پڑاو ڈالا اور وہیں پھر قریش سے مذاکرات کے بعد معاہدہ طے پایا جو عام طور پر معاہدۂ حدیبیہ کہلاتا ہے اور جسے قرآن کریم نے "فتح مبین" سے تعبیر کیا۔ اس معاہدے میں دیگر امور کے علاوہ یہ طے پایا کہ معاہدے کے فریق دس سال تک ایک دوسرے جنگ نہیں لڑیں گے۔ (تفصیل کے لیے دیکھیے: شبلی نعمانی و سید سلیمان ندوی، **سیرت النبی ﷺ** (کراچی: دارالاشاعت، ۱۹۸۵ء)، ۱: ۲۶۰ ومابعد)

﴿ ¢ £ ﴾ کا اشارہ بہ ظاہر قریش ہی کی طرف ہے اور ﴿ w x ﴾ سے معلوم ہوتا ہے کہ معاہدہ ابھی توڑا نہیں گیا۔[۱۰]

آیات ۱۳ ومابعد کا نزول نقضِ معاہدہ کے بعد ہوا۔

اس دعوے کے شواہد یہ ہیں:

اولاً: آیت ۱۳ میں فرمایا: M ¬ ® ¯ ° ± 2 3

ٱلرَّسُولِ وَهُم بَدَءُوكُمۡ أَوَّلَ مَرَّةٍ » ½ ¾ ¿ À Á Â

Ã L (بھلا تم ایسے لوگوں سے نہیں لڑو گے جنھوں نے اپنی قسمیں توڑ دی ہیں اور رسول کو نکالنے کا قصد کیا اور وہی ہیں جنھوں نے جنگ چھیڑنے میں پہل کی؟ کیا تم ان سے ڈرتے ہو؟ اللہ اس کا زیادہ مستحق ہے کہ تم اس سے ڈرو اگر تم واقعی مومن ہو۔)

اس آیت میں بھی بہ ظاہر قریش ہی مراد ہیں کیوں کہ جو جرائم ذکر کیے گئے ﴿ 2 3

ٱلرَّسُولِ وَهُم بَدَءُوكُمۡ أَوَّلَ مَرَّةٍ ﴾ ان کا ارتکاب قریش ہی نے کیا تھا۔ نیز ﴿ » ﴾ سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ مراد قریش ہی ہیں کیوں کہ ۷ھ میں غزوۂ خیبر نے یہود کا سارا دم خم نکال دیا تھا،[۱۱] اور

۱۰- جیسا کہ آگے ذکر کیا جائے گا، مولانا تھانوی، مولانا اصلاحی اور بیش تر قدیم مفسرین نے یہاں معاہدے سے صلح حدیبیہ مراد لیا ہے۔ اس معاہدے میں دیگر قبائل کے لیے گنجایش چھوڑ دی گئی تھی کہ وہ مسلمانوں یا قریش کے حلیف بنیں؛ چناں چہ بنو خزاعہ مسلمانوں کے، اور بنو بکر قریش کے حلیف بنے اور ان دونوں قبائل کے تعلقات پہلے ہی سے خراب تھے۔ جیسا کہ عرب جاہلیت میں دستور تھا، دشمن پر حملے کے لیے لوگ موقع کی تلاش میں رہتے تھے اور بعض اوقات حرمت کے مہینوں یا حدود حرم کی بھی پامالی کر لیتے، اگرچہ ایسے فعل کو بالعموم ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ چناں چہ بنو بکر نے موقع پا کر بنو خزاعہ پر حملہ کیا اور جب انھوں نے حرم میں پناہ لی تو وہاں بھی انھوں نے ہاتھ نہیں روکا۔ قریش نے اس حملے میں بنو بکر کی مدد کی تھی جو معاہدۂ حدیبیہ کی کھلی خلاف ورزی تھی۔ بنو خزاعہ رسول اللہ ﷺ کے پاس فریاد لے کر گئے کیوں کہ وہ آپ کے حلیف تھے۔ اس کے بعد رسول اللہ ﷺ نے مکہ کی طرف پیش قدمی کی اور رمضان ۸ھ میں وہ مبارک ساعت آئی جس کا سالہا سال سے مسلمان انتظار کر رہے تھے۔ (شبلی نعمانی، سلیمان ندوی، مرجع سابق، ۲۹۴-۳۰۴)

۱۱- معاہدۂ حدیبیہ کے نتیجے میں قریش کی جانب سے مطمئن ہونے کے فوراً بعد رسول اللہ ﷺ نے محرم ۷ھ کے آخری ایام میں خیبر کی طرف پیش قدمی کی اور جلد ہی اسے فتح کر کے جزیرۂ عرب میں یہود کی قوت ہمیشہ کے لیے ختم کر دی۔ (شبلی نعمانی، سلیمان ندوی، مرجع سابق، ۲۷۷- ۲۸۳)

جزیرۃ العرب میں مسلمانوں کے جن قبائل سے معاہدات ہوئے تھے ان میں قریش ہی کے متعلق یہ کہا جاسکتا تھا کہ 'کیا تم ان سے ڈرتے ہو؟' پس یہاں مراد قریش ہی کا نقض عہد ہے اور ﴿ ° ± ﴾ سے صاف واضح ہوا کہ یہ اور اس کے بعد کی آیات اس وقت نازل ہوئیں جب قریش نے معاہدہ توڑ دیا تھا۔[۱۲]

ثانیاً: آگے آیت ۲۵ میں تصریح کی گئی ہے کہ ان آیات کے نزول کے وقت نہ صرف مکہ فتح ہو چکا تھا بلکہ غزوۂ حنین میں بھی مسلمانوں کو فتح مل چکی تھی:[۱۳]

z y x v u t s r q p o n M

} تُغۡنِ عَنكُمۡ شَيۡـًٔا وَضَاقَتۡ عَلَيۡكُمُ ٱلۡأَرۡضُ بِمَا رَحُبَتۡ ثُمَّ وَلَّيۡتُم

§ L (بے شک اللہ نے بہت سے مواقع پر تمھاری مدد کی ہے اور ابھی حنین کے دن بھی جب

۱۲- بعض تفسیری روایات میں عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما (م ۶۸ھ) کا قول ذکر کیا گیا ہے کہ اس آیت اور اس کے بعد کی آیات میں مسلمانوں کو فتح مکہ کے لیے قتال کی ترغیب دی گئی۔ (الوسی، **روح المعاني**، ۱۰: ۶۵۔) علامہ آلوسی نے عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے اس قول پر یہ اعتراض نقل کیا ہے کہ سورۃ التوبۃ کا نزول تو فتح مکہ کے بعد ہوا ہے، پھر اس اعتراض کا جواب ان الفاظ میں دیا ہے: "و أجيب بأن أولها نزل بعد الفتح، و هذا قبله"۔ (نفسِ مرجع) (اس اعتراض کا جواب یہ ہے کہ سورۃ التوبہ کا ابتدائی حصہ فتح مکہ کے بعد نازل ہوا اور یہ حصہ فتح سے پہلے نازل ہوا۔] یہ بات نہایت تعجب انگیز معلوم ہوتی ہے کیوں کہ اس سے قبل آیت ۷ M ! " # $ ﴾ کی تفسیر میں خود علامہ الوسی کہتے ہیں: تبيين للحكمة الداعية لما سبق من البراءة و لواحقها ؛ و المراد من المشركين : الناكثون ، لأن البراءة انما هي في شأنهم۔ (الوسی، مرجع سابق، ۱۰: ۵۴) ۔ اگر آیات ۷ تا ۱۲ دراصل پہلی چھے آیات میں مذکور اعلانِ براءت کی حکمت کی توضیح کر رہی ہیں اور آیت ۱۲ میں پیش گوئی کی گئی کہ یہ باقی ماندہ گروہ بھی معاہدہ توڑ دینے کے درپے ہیں اور پھر جب ان لوگوں نے واقعتاً معاہدہ توڑ دیا گیا اور آیت ۱۳ میں ان سے قتال کا حکم دیا گیا تو کیسے یہ مانا جاسکتا ہے کہ آیت ۱۳ و مابعد کا نزول پہلی چھے آیات سے قبل ہوا؟ اس الجھن پر آگے تفصیلی بحث آرہی ہے۔

۱۳- فتح مکہ کے بعد شوال ۸ھ میں حنین کا معرکہ برپا ہوا۔ (شبلی، سلیمان ندوی، **سیرت النبی ﷺ**، ۱ : ۳۰۵) اس جنگ میں مسلمانوں کے ساتھ کثیر تعداد میں ان نو مسلموں نے بھی شرکت کی جو فتح مکہ کے موقع پر مسلمان ہوئے تھے۔ اس لیے نظم و ضبط کا وہ منظر نہیں تھا جو دیگر غزوات میں نظر آتا تھا۔ اسی وجہ سے ابتدا میں مسلمانوں کو سخت تکلیف اٹھانی پڑی لیکن جلیل القدر صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے ثابت قدمی دکھائی اور بڑا حملہ پسپا کر دیا۔ اس کے بعد مسلمانوں نے طائف کا محاصرہ کیا۔ (نفسِ مرجع، ۳۰۵-۳۱۴) ان آیات میں انھی واقعات کی طرف اشارہ ہے۔

کہ تمھیں اپنی کثرت تعداد کا غرہ تھا مگر وہ کثرت تمھارے کچھ کام نہ آئی اور زمین اپنی وسعت کے باوجود تم پر تنگ ہو گئی پھر تم پیٹھ پھیر کر بھاگ نکلے۔)

ثالثاً: یہی بات آگے آیت ۲۸ سے بھی معلوم ہوتی ہے: M / 0 1 2 3 4 5 6 7 8 9 : ; < L (اے ایمان والو! بے شک یہ مشرکین ناپاک ہیں تو یہ اپنے اس سال کے بعد مسجد حرام کے قریب نہ پھٹکنے پائیں۔)

یہ اعلان، جیسا کہ مسلم ہے، ۹ھ کے حج کے موقع پر کیا گیا۔[۱۴] پس یہ قطعی طور پر معلوم ہوا کہ آیت ۱۳ ومابعد کا نزول نقضِ معاہدہ کے بعد ہوا۔

جیسا کہ آگے تفصیل آئے گی، مولانا تھانوی ان آیات کو معاہدۂ حدیبیہ سے متعلق سمجھتے ہیں، اس لیے انھیں یہ رائے اختیار کرنی پڑی کہ یہ آیات دو ٹکڑوں میں نازل ہوئی ہیں: آیات ۱۳ تا ۲۲ کا نزول نقضِ صلحِ حدیبیہ کے بعد قبل از فتح مکہ، اور آیات ۲۳ تا ۲۸ کا نزول فتحِ مکہ و غزوۂ حنین کے بعد ۹ھ میں ہوا۔[۱۵] آیات ۱۳ تا ۲۲ کے فتحِ مکہ سے قبل نزول کی ایک دلیل یہ دی جاتی ہے کہ ان آیات میں مشرکینِ مکہ کے اس زعم کی تردید کی گئی کہ وہ چوں کہ حجاج کی خدمت کرتے ہیں اس لیے وہ کعبے کی تولیت کا استحقاق رکھتے ہیں۔ فتحِ مکہ کے موقع پر ہی رسول اللہ ﷺ نے حجاج کی خدمت کے کام مشرکین سے لے کر مسلمانوں کے حوالے کر دیے تھے۔[۱۶]

۱۴- روایات میں تصریح کی گئی ہے کہ ۹ھ کے حج کے موقع پر چار باتوں کی خصوصی منادی کی گئی: اس سال کے بعد مشرک مسجد حرام میں داخل نہیں ہو سکے گا؛ کوئی شخص بیت اللہ کا برہنہ طواف نہیں کرے گا؛ جس کے ساتھ رسول اللہ ﷺ کا (موقت) معاہدہ ہوا ہے (اور اس نے معاہدے کی خلاف ورزی نہیں کی ہے) اس کے ساتھ مدت پوری ہونے تک معاہدہ برقرار رہے گا؛ اور جنت میں صرف مومن ہی داخل ہو سکیں گے۔ (روایات کی تفصیل کے لیے دیکھیے: طبری، **جامع البیان**، ۱۴: ۱۰۳-۱۰۹۔)

۱۵- مولانا اصلاحی نے بھی تقریباً یہی رائے اختیار کی ہے اور قدیم مفسرین میں بھی یہ قوی رجحان پایا جاتا ہے۔

۱۶- ابو القاسم عبد الرحمان بن عبد اللہ الخثعمی السہیلی، **الروض الأنف في تفسير السيرة النبوية لابن هشام**، تحقیق مجدی بن منصور (بیروت: دار الكتب العلمية، ت۔ن)، ۴: ۱۷۰-۱۷۲۔ اس مسئلے پر فصلِ چہارم میں بحث کی جائے گی۔

یہ راے مان لینے سے آیات کے زمانۂ نزول کے متعلق ان تمام اشکالات کا حل مل جاتا ہے جو جمہور مفسرین کی راے پر عائد ہوتے ہیں۔ چناں چہ ﴿ (* + , - . ﴾ اور أَئِمَّةَ ٱلكُفرِ سے متبادر مفہوم کے مطابق قریش ہی مراد لیے جائیں گے اور ﴿ 0 1 2 3 4 ﴾ اور ﴿ w x y ﴾ کے الفاظ کے ظاہری مفہوم کے مطابق یہ بھی مان لیا جائے گا کہ ان آیات کے نزول کے وقت معاہدۂ حدیبیہ کا نقض واقع نہیں ہوا تھا۔ اسی طرح ﴿ ¬ ® ¯ ° ± ﴾ کے الفاظ کے ظاہری مفہوم کے مطابق مان لیا جائے گا کہ ان کا نزول نقض عہد حدیبیہ کے فوراً بعد ہوا اور چوں کہ ابھی مکہ فتح نہیں ہوا تھا اس لیے قریش کے متعلق ﴿ « ﴾ کہا جانا بھی بالکل مناسب تھا۔ نیز آیت ۲۵ میں یوم حنین اور آیت ۲۸ میں بَعدَ عَامِهِم هٰذَا کے الفاظ کی وجہ سے یہ ماننے میں کوئی رکاوٹ نہیں رہتی کہ یہ حصہ غزوۂ حنین کے بعد ۹ھ میں نازل ہوا۔ تاہم پہلی چھے آیات کے زمانۂ نزول کا تعین ایک پیچیدہ مسئلہ بن جاتا ہے۔

فصلِ دوم: مولانا امین احسن اصلاحی کی راے کا تنقیدی جائزہ

مولانا اصلاحی کی راے یہ ہے کہ ﴿ (* + , - . ﴾ اور أَئِمَّةَ ٱلكُفرِ سے مراد قریش ہیں اور ﴿ 0 1 2 3 4 ﴾ اور ﴿ M w x y ﴾ کے الفاظ سے وہ یہ استدلال کرتے ہیں کہ ان آیات کے نزول کے وقت معاہدۂ حدیبیہ کا نقض واقع نہیں ہوا تھا، نیز وہ آیات ۱ تا ۶ کے متعلق یہ قرار دیتے ہیں کہ ان کا نزول آیات ۷ تا ۱۲ کے ساتھ ہی ہوا۔ وہ سورۃ التوبۃ کی ابتدائی آیات کو پیش گوئی پر محمول کرتے ہوئے قرار دیتے ہیں کہ ان آیات کا نزول ۹ھ میں نہیں ہوا، جیسا کہ عام طور پر قرار دیا گیا ہے، بلکہ ان کا صرف اعلان ہی ۹ھ کے حج کے موقع پر ہوا:

> 'حج اکبر' سے کیا مراد ہے اور یہ کس سن کے حج کی طرف اشارہ ہے؟ اس سوال کا جواب مفسرین نے یہ دیا ہے کہ اس سے مراد ۹ھ کا حج ہے جو حضرت ابو بکر صدیقؓ کی امارت میں ہوا۔ ہمارے نزدیک یہ بات ٹھیک ہے۔۔۔ یہیں سے عام طور پر لوگوں نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ اس سورہ کا نزول ۹ھ میں ہوا ہے لیکن اس نتیجہ کو قبول کرنے میں مجھے تردد ہے اس لیے کہ آگے جو آیات آ رہی ہیں ان سے، جیسا کہ آپ دیکھیں گے، صاف واضح ہے کہ کم از کم یہ اور آگے کی آیات معاہدہ حدیبیہ کے خاتمہ اور فتح مکہ سے کچھ پہلے نازل ہوئی ہیں لیکن اعلان براءت کی منادیِ عام چوں کہ آنحضرت ﷺ نے ۹ھ کے حج کے موقع پر ہی کرائی اس لیے

بعض لوگوں کو یہ گمان گزرا کہ ان آیات کا نزول بھی اسی موقع پر ہوا۔ حالانکہ یہ ایک پیشگی ہدایت تھی اس بات کی کہ جب حج اکبر کی سعادت حاصل کرنے کا موقع آئے تو اس موقع پر اس فیصلہ کی منادیِ عام بھی کرادی جائے۔ اس سے ضمناً مسلمانوں کو، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، حج سے مشرف ہونے کی بشارت بھی حاصل ہوگئی۔ (۱۷)

اس رائے پر پیدا ہونے والے اشکالات

جیسا کہ ہم نے اوپر واضح کیا، آیت ۷ تا ۱۲ کے متعلق تو یہ بات مانی جاسکتی ہے کہ ان کا نزول نقض عہد حدیبیہ سے قبل ہوا لیکن ابتدائی چھے آیات کے متعلق بھی یہی قرار دیا جائے تو اس سے کئی مسائل پیدا ہوتے ہیں:

اولاً: اگر ابھی مکہ فتح بھی نہیں ہوا تھا تو مشرکین سے اعلان براءت کیسے کیا جاسکتا تھا اور ان کے متعلق یہ احکام کیسے دیے جاسکتے تھے کہ حرمت کے مہینے گزر جانے کے بعد ان کا گھیراؤ کرو اور جہاں کہیں بھی ان کو پاؤ ان کو قتل کر دو تا آنکہ یہ اسلام قبول کر لیں؟ یہ بھی نہیں کہا جاسکتا کہ یہ احکام قریش مکہ کے بجائے دیگر مشرکین کے متعلق تھے کیوں کہ ان احکام کا اولین اطلاق قریش مکہ ہی پر ہونا تھا اور مشرکین کے ساتھ مسلمانوں کی کشمکش میں اصل فریق کی حیثیت بھی قریش ہی کو حاصل تھی۔

ثانیاً: اگر اعلان ۹ھ کے حج اکبر کے موقع پر کیا جانا تھا اور اس موقع پر مخالفین کو چار مہینوں کی مہلت دی جانی تھی تو اس سے سوا سال پہلے کیسے یہ حکم نازل کیا گیا؟

۱۷- امین احسن اصلاحی، **تدبر قرآن** (لاہور: فاران فاؤنڈیشن، ۲۰۰۵ء)، ۳: ۵۳۸۔ واضح رہے کہ مولانا اصلاحی سے قبل اسی رائے کا اظہار علامہ شبلی نعمانی اور سید سلیمان ندوی نے بھی کیا تھا۔ چناں چہ سیرت النبی ﷺ میں جہاں علامہ شبلی نے اعلانِ براءت کا مختصراً ذکر کیا ہے وہاں سید صاحب نے یہ حاشیہ لکھا: "ان آیات میں یہ بیان ہے کہ مسجد حرام کے پاس (صلح حدیبیہ میں) جو معاہدے ہوئے تھے وہ ٹوٹ گئے، لیکن وہ معاہدے تو فتح مکہ سے پہلے ہی ٹوٹ گئے تھے اور اس کے بعد کفار سے کوئی معاہدے نہیں ہوا۔ مصنف نے اس بنا پر اپنے ایک مکتوب ۴۰ - ۷۲ میں یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ یہ آیتیں ۸ھ میں فتح مکہ کے وقت نازل ہوئی ہوں گی اور شاید اسی لیے مصنف نے یہ واقعات قلم انداز کر دیے ہیں۔ لیکن خاکسار جامع کا خیال یہ ہے کہ ممکن ہے کہ معاہدے کے متعلق یہ آیتیں گو ۸ھ میں نازل ہوئی ہوں لیکن ان کا عام اعلان مع دیگر ضروری احکام کے، جیسا کہ صحاحِ ستہ کی مستند روایات میں مذکور ہے، ۹ھ کے موسم حج میں ہوا ہو۔" (شبلی، سلیمان ندوی، **سیرت النبی ﷺ**، ۱: ۳۲۱۔) اس نظریے کی بنیاد اس مفروضے پر ہے کہ فتح مکہ کے بعد مشرکین کے ساتھ کوئی اور معاہدہ نہیں ہوا جس کے نقض کی نوبت آتی۔ آگے فصل چہارم میں اس مفروضے کا بطلان واضح کیا جائے گا جس کے بعد یہ اشکال دور ہو جاتا ہے اور تمام روایات اپنی جگہ صحیح بیٹھ جاتی ہیں اور آیات کے ظاہر کی تاویل کی بھی ضرورت پیش نہیں آتی۔

ثالثاً: اگر ان آیات کا نزول نقضِ حدیبیہ (شعبان ۸ھ) سے پہلے ہوا تو حرمت کے مہینوں کا اختتام محرم ۹ھ کے اختتام پر ہونا تھا اور ایسی صورت میں مسلمانوں پر لازم ہوتا کہ ان آیات میں مذکور احکام پر عمل صفر ۹ھ سے شروع کر لیتے، لیکن تاریخی طور پر مسلم ہے کہ مسلمانوں نے ان آیات کا اعلان ۹ھ کے حج کے موقع پر کیا اور ان پر عمل درآمد صفر ۱۰ھ سے ہونا تھا، لیکن تب تک تمام مشرکین اسلام قبول کر چکے تھے۔[۱۸]

غالباً انھی کم زوریوں کی وجہ سے آیات ۱ تا ۶ کے نزول کو قبل از نقضِ حدیبیہ مان لینا جمہور مفسرین کے لیے ممکن نہیں تھا۔ دوسری طرف صحیح اور مستند روایات میں قرار دیا گیا تھا کہ ان آیات کا اعلان ۹ھ کے حج کے موقع پر کیا گیا، نیز آگے آیت ۲۸ میں قرار دیا گیا ہے کہ "اس سال" کے بعد مشرکین کے حج پر پابندی عائد ہو جائے گی، اس لیے انھوں نے عام طور پر قرار دیا کہ آیات ۱ تا ۲۸ ایک ہی موقع پر، یعنی ۹ھ کے موسم حج میں، نازل ہوئیں۔ تاہم یہ رائے قائم کر لینے کے بعد ان کو ان دیگر آیات کی تاویل کرنی پڑی جن سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ وہ قبل از نقض عہد حدیبیہ نازل ہوئیں۔ ذیل میں ان تاویلات کا جائزہ پیش کیا جاتا ہے۔

کیا مراد قریش نہیں ہیں؟

چناں چہ کئی مفسرین نے قرار دیا کہ آیت ۷ میں ﴿ (* + , - . ﴾ سے مراد قریش نہیں ہیں اور یہ اشارہ معاہدۂ حدیبیہ کی طرف نہیں ہے۔ ان میں سے بعض نے اسے بنو بکر، بعض

۱۸- فقہاے کرام کا اس معاملے میں اختلاف ہے کہ کیا عرب مشرکین کو ذمی بنا کر ان سے جزیہ وصول کیا جا سکتا ہے یا نہیں؟ جمہور فقہا کی رائے یہ ہے کہ ان کو ذمی بنایا جا سکتا ہے، جب کہ فقہاے احناف اس کی مخالفت کرتے ہیں۔ (جمہور فقہا کی رائے کے لیے دیکھیے: محمد بن احمد بن عرفۃ الدسوقی، **حاشیۃ علی الشرح الکبیر** (قاہرہ: مکتبۃ مصطفی محمد، ۱۳۷۳ھ)۔ ۲: ۲۰۱؛ محمد بن علی الشوکانی، **نیل الأوطار شرح منتقی الأخبار** (قاہرہ: المطبعۃ العثمانیۃ المصریۃ، ۱۹۲۵ء)، ۷: ۲۳۲) حنفی فقہا کے دلائل کے لیے دیکھیے: ابو بکر محمد بن ابی سہل السرخسی، **المبسوط** (بیروت: دار المعرفۃ، ت۔ن)، ۱۰: ۳۷-۴۰۔ حنبلی فقیہ امام ابن قیم الجوزیہ کی تحقیق یہ ہے کہ اس اختلاف کا کوئی عملی نتیجہ اس وجہ سے نہیں نکلا کہ اعلانِ براءت کے نفاذ کا موقع ہی نہیں آیا، کیوں کہ مہلت کے اختتام تک تمام عرب اسلام قبول کر چکے تھے۔ (شمس الدین محمد بن ابی بکر ابن قیم الجوزیۃ، **أحکام أهل الذمة** (بیروت: دار الکتب العلمیۃ، ۲۰۰۲ء)، ۱: ۲۴۔)

نے بنو جذیمہ اور بعض نے بنو خزاعہ مراد لیے ہیں۔[۱۹] امام ابو جعفر محمد بن جریر الطبری رحمۃ اللہ علیہ (م ۳۱۰ھ) نے خود اس رائے کو ترجیح دی ہے کہ یہاں مراد بنو بکر ہیں اور وجہ یہ ذکر کی ہے کہ اعلان براءت ۹ھ میں کیا گیا اور تب تک مکہ میں قریش اور بنو خزاعہ کے کفار کا وجود باقی نہیں رہا تھا۔[۲۰] اس دلیل کی کم زوری واضح ہے۔ اعلان براءت تو بے شک ۹ھ میں کیا گیا لیکن اگر آیات ۷ ومابعد کے الفاظ کی ظاہری دلالت یہ ہو کہ ان کا نزول نقضِ عہد سے قبل ہوا تو اس سے صرفِ نظر کیسے کیا جاسکتا ہے؟[۲۱]

قریش کے بجائے دیگر قبائل مراد لینے میں کم زوری یہ ہے کہ اس کے لیے الفاظ کے ظاہری مفہوم کے بجاے ایک دور از کار تاویل کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ ﴿ (* + , - . ﴾ سے متبادر یہی ہے کہ اشارہ قریش کی طرف ہے اور مولانا اصلاحی کا موقف یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جتنے بھی معاہدات کیے ان میں معاہدۂ حدیبیہ ہی وہ معاہدہ ہے جس کے متعلق کہا جاسکتا تھا کہ یہ معاہدہ تم نے مسجد حرام کے قریب کیا ہے۔[۲۲]

۱۹- تفصیل کے لیے دیکھیے: طبری، **جامع البیان**، ۱۴: ۱۴۱-۱۴۴۔

۲۰- نفسِ مصدر، ۱۴۴۔

۲۱- مولانا تھانوی کی رائے یہ ہے کہ یہاں مراد بنی ضمرہ اور بنو مدلج ہیں جو معاہدے پر برقرار رہے تھے۔ (اشرف علی تھانوی، **بیان القرآن** (لاہور: ادارۂ تالیفات اشرفیہ، ۱۴۲۵ھ)، ۲: ۱۰۷، ۱۱۱ اور ۱۱۳-۱۱۵)۔ مولانا مودودی نے بھی یہی رائے اختیار کی ہے۔ (مودودی، **تفہیم القرآن**، ۲: ۱۷۸)۔

۲۲- اصلاحی، **تدبر قرآن**، ۲: ۵۴۳۔ خود قرآن نے حدیبیہ کو بطنِ مکّۃ کے الفاظ سے تعبیر کیا ہے۔ (القرآن ۴۸: ۲۴) مولانا تھانوی , - . سے مراد حدیبیہ ہی لیتے ہیں لیکن چوں کہ **الدرالمنثور** کی اتباع میں وہ یہ قرار دیتے ہیں کہ اس مخصوص گروہ سے مراد بنو ضمرہ اور بنو مدلج ہیں اس لیے وہ یہ فرض کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ "اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان سے بھی حدیبیہ میں خاص گفتگو ہوئی ہوگی۔" (تھانوی، مرجعِ سابق، ۲: ۱۱۵)۔ امام طبری نے کئی اسناد سے عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی رائے نقل کی ہے کہ اَلَّذِينَ عٰهَدتُّم عِندَ اَلمَسجِدِ اَلحَرَامِ سے مراد قریش ہیں اور یہ کہ یہاں اشارہ معاہدۂ حدیبیہ کی طرف ہے۔ (طبری، **جامع البیان**، ۱۴: ۱۴۲-۱۴۳۔) ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ہی یہ روایت بھی کی گئی ہے کہ یہ حکم بعد میں تبدیل ہوا اور یہ کہ فتح مکہ کے بعد ہی وہ آیات نازل ہوئی ہیں جن میں مشرکین کو چار مہینوں کی مہلت دی گئی۔ (مصدرِ سابق) گویا یہاں پھر یہ فرض کرنا پڑتا ہے کہ موجودہ ترتیب میں منسوخ آیت ناسخ آیت کے بعد رکھی گئی ہے۔ یہ اپنی جگہ ایک پیچیدہ مسئلہ بن جاتا ہے جس پر آگے فصلِ سوم میں بحث کی جائے گی۔

اسی طرح بعض قدیم مفسرین نے آیت ۱۳ میں أَئِمَّةَ ٱلكُفرِ سے قریش کے بجاے یہود مراد لیے ہیں۔[۲۳] تاہم یہ راے واضح طور پر غلط نظر آتی ہے۔ اس کی کئی وجوہات ہیں:

اولاً: عہد رسالت میں جزیرۃ العرب میں اس خطاب کے مصداق قریش مکہ ہی تھے۔

ثانیاً: آیات ۱۳ تا ۲۲ میں جو جرائم ذکر کیے گئے ہیں وہ سارے کے سارے قریش ہی کے جرائم ہیں۔[۲۴]

ثالثاً: معاہدۂ حدیبیہ کے بعد کے دور میں یہود کی کوئی طاقت باقی نہیں رہی تھی جس کی بنا پر مسلمانوں کو ان سے کوئی خوف محسوس ہوتا۔ بنو قینقاع اور بنو نضیر مدینہ منورہ سے نکالے جا چکے تھے اور بنو قریظہ کو عبرت کا نشانہ بنایا جا چکا تھا۔ یہود خیبر اور قریش مکہ کا اتحاد معاہدۂ حدیبیہ کی وجہ سے ٹوٹ چکا تھا۔ اس لیے سورۃ الفتح میں بار بار تصریح کی گئی ہے کہ حدیبیہ سے واپسی کے بعد جب مسلمان خیبر کا رخ کریں گے تو اللہ تعالیٰ انھیں کثیر مغانم عطا کرے گا۔ یہ بھی تصریح کی گئی کہ وہ لوگ جو سفر حدیبیہ کے موقع پر پیچھے رہے وہ بھی غنائم کے حصول کے اس آسان موقع پر مسلمانوں کے ساتھ شامل ہونا چاہیں گے لیکن انھیں شامل نہیں ہونے دیا جائے گا۔ البتہ ان لوگوں کو یہ موقع دیا جائے گا کہ ایک "سخت جنگجو قوم" کے ساتھ جنگ کے موقع پر انھیں جنگ میں حصہ لینے کو کہا جائے گا:

, + *) (' & % $ # " ! M

; : 9 8 7 6 4 3 2 1 0 / -

۲۳- الوسی، **روح المعاني**، ۱۰: ۶۴۔ مفتی محمد شفیع (م۱۹۷۶ء) نے بھی یہی قول اختیار کیا ہے۔ (مفتی محمد شفیع، **معارف القرآن** (کراچی: ادارۃ المعارف، ۱۹۷۵ء)، ۳: ۳۲۴۔)

۲۴- اس موقف کے حق میں ایک دلیل یہ دی جاتی ہے کہ ان آیات میں اللہ تعالیٰ کی آیات کے مقابلے میں متاعِ دنیا کو ترجیح دینے کا جرم قرآن نے عموماً یہود کی طرف منسوب کیا ہے۔ تاہم یہ دلیل زیادہ مضبوط نہیں ہے کیوں کہ قرآن مجید میں اس ترکیب کا استعمال یہود کے ساتھ مخصوص نہیں ہے، بلکہ آخرت پر متاعِ دنیا کو ترجیح دینے والے دیگر افراد پر بھی ہوا ہے جیسا کہ سورۃ المآئدہ کی آیت ۱۰۶ میں وصیت پر گواہی کے ضمن میں بھی آیا ہے۔ آگے فصل چہارم میں واضح کیا جائے گا کہ یہاں مراد مشرکینِ عرب کے مذہبی پیش وا ہیں جو یہودی ربیوں کی طرح لوگوں کو جانتے بوجھتے گم راہ کر رہے تھے۔

< = > L (کہہ دو اہل بدو میں ان پیچھے چھوڑے ہوئے لوگوں کو کہ عنقریب تم ایسے لوگوں سے لڑنے کے لیے بلائے جاؤ گے جو بڑے زورآور ہیں۔ تم کو ان سے جنگ جاری رکھنی ہو گی یا وہ اسلام لے آئیں گے۔)

یہاں بھی مراد قریش ہی ہیں کیوں کہ اسلام اور تلوار میں ایک کو اختیار کرنے کا حکم انھی کے متعلق تھا، نہ کہ یہود یا نصاریٰ کے متعلق۔[۲۵]

سوال یہ ہے کہ ان واضح تصریحات کی موجودگی میں کیسے یہ رائے اختیار کی گئی کہ أَئِمَّةَ ٱلكُفرِ سے مراد قریش نہیں ہیں؟ امام ابو عبد اللہ محمد بن احمد الانصاری القرطبی رحمۃ اللہ علیہ (م ۶۷۱ھ) نے یہاں جو کچھ کہا ہے اس سے بہ خوبی اندازہ ہو جاتا ہے کہ یہ رائے کیوں اختیار کی گئی ہے: "وهذا بعيد فان الآية في سورة براءة، و حين نزلت و قرئت على الناس كان الله قد استأصل شأفة قريش، فلم يبق الا مسلم أو مسالم." [۲۶] (یہ بات بعید ہے کیوں کہ یہ آیت سورت براءۃ میں ہے، اور جس وقت یہ نازل ہوئی اور لوگوں کے سامنے پڑھی گئی تو اللہ تعالیٰ نے قریش کی کمر توڑ دی تھی، پھر ان میں وہی باقی رہے تھے جو مسلمان ہو چکے تھے یا صلح کرنا چاہتے تھے۔)

یہ وہی بات ہے جو اوپر امام طبری کے حوالے سے گزری۔ جیسا کہ واضح ہے، اس رائے کی بنیاد اس امر پر ہے کہ آیت ۱۳ بھی دیگر آیات کی طرح ۹ھ میں نازل ہوئی جب قریش کی قوت کا خاتمہ ہو چکا تھا۔ سوال یہ نہیں کہ جب قریش کی قوت ختم ہو چکی تھی تو انھیں أَئِمَّةَ ٱلكُفرِ کیسے کہا جا سکتا تھا، بلکہ سوال اصل میں یہ ہونا چاہیے کہ

۲۵- "وقال بعض أهل العلم: لا يجوز أن تكون هذه الآية إلا في العرب، لقوله: تُقَٰتِلُونَهُمْ أَوْ يُسْلِمُونَ؛ و فارس و الروم إنما يقاتلون حتى يسلموا أو يؤدوا الجزية" (ابو الفرج جمال الدین عبد الرحمان بن علی بن محمد الجوزی، **زاد المسير في علم التفسير** (بیروت: المكتب الإسلامي، ۲۰۰۲ء)، ۱۳۲۰-۱۳۲۱۔) اب یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ سورۃ الفتح کی آیات کے نزول کے وقت عرب میں بھی بالخصوص مراد قریش ہی ہو سکتے تھے۔ پس اس آیت میں مذکور قوم سے اصلاً مراد قریش مکہ ہیں۔

۲۶- القرطبی، **الجامع**، ۱۰: ۱۲۶۔

جب یہ خطاب صرف قریش کو دیا جاسکتا تھا اور اس آیت اور بعد کی آیات میں مذکور تمام جرائم قریش ہی کے ہیں تو یہ کیسے مانا جاسکتا ہے کہ یہ آیت ۹ھ میں نازل ہوئی؟

ان امور کی بنا پر اگر مولانا اصلاحی کی یہ بات مان بھی لی جائے کہ آیات ۷ تا ۱۲ قبل از نقضِ حدیبیہ نازل ہوئیں اور آیات ۱۳ و مابعد نقضِ حدیبیہ کے بعد اور فتحِ مکہ سے قبل نازل ہوئیں تو ان کی یہ بات ماننا نہایت مشکل ہے کہ آیات ۱ تا ۶ کا نزول بھی آیات ۷ تا ۱۲ کے ساتھ قبل از نقض عہد حدیبیہ ہوا۔ کیا اس اشکال کا یہ حل مناسب ہو گا کہ آیات ۱ تا ۶ کے نزول کے بارے میں عام روایات قبول کی جائیں اور مان لیا جائے کہ ان کا نزول ۹ھ میں ہی ہوا؟ بہ الفاظ دیگر، یہ کہا جائے کہ آیات ۱ تا ۲۸ کا نزول تین مرحلوں میں اس طور پر ہوا کہ:

- ❖ آیات ۷ تا ۱۲ کا نزول قبل از نقض عہد حدیبیہ ہوا۔
- ❖ آیات ۱۳ تا ۲۲ کا نزول نقض عہد حدیبیہ کے فوراً بعد قبل از فتح مکہ ہوا، اور
- ❖ آیات ۱ تا ۶ اور آیات ۲۳ تا ۲۸ کا نزول فتح مکہ اور غزوۂ حنین کے بعد ۹ھ میں ہوا۔

مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے یہی رائے اختیار کی ہے۔

فصلِ سوم: مولانا اشرف علی تھانوی کی تحقیق

تفسیر سورۃ التوبۃ کی تمہید کے فائدۂ دوم میں مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں:

فتحِ مکہ کے متعلق جو آیات ہیں (آیات ۷ تا ۲۲) ان کے مضمون پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ قبلِ فتح نازل ہوئیں۔۔۔ البتہ غزوۂ حنین کے متعلق جو آیات ہیں (آیات ۲۳ تا ۲۸) وہ اس کے وقوع کے بعد کی ہیں۔۔۔ اب رہ گئیں تبوک و اعلان (براءت) کی آیات، سو **اتقان** ہی میں عامر رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ اول آیات ترغیبِ غزوۂ تبوک کی انفروا خفافاً و ثقالاً الخ یعنی مع سیاق و سباق کے نازل ہوئیں۔ پھر بعدِ واپسیِ تبوک کے اور آیتیں، یعنی آخر کی آیتیں جن میں تخلفِ تبوک پر ملامت و عتاب ہے، نازل ہوئیں۔ پھر اول کی آیتیں، جن میں نقض و اخراج کا حکم ہے، (آیات ۱ تا ۶) نازل ہوئیں۔ اور ان آخری آیاتِ نازلہ کا جو بعض سلف سے عدد منقول ہے جس میں آیات فتح (آیات ۷ تا ۲۲) بھی داخل ہوئی جاتی ہیں، غالب یہ ہے کہ قلتِ تامل سے اجتہادی خطا ہوئی ہے۔[۲۷]

آگے اس تحقیق کا خلاصہ ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں:

۲۷- تھانوی، **بیان القرآن**، ۲: ۱۰۷۔

پس اس تقریر پر ترتیب نزولِ آیات کی یہ ہوئی کہ اول آیات متعلقہ فتح مکہ قبل فتح مکہ (آیات ۷ تا ۲۲)، پھر آیاتِ حنین بعدِ حنین (آیات ۳۲ تا ۸۲)، پھر آیاتِ ترغیبِ غزوۂ تبوک قبلِ تبوک، پھر آیاتِ ملامتِ تخلفِ تبوک بعدِ تبوک، پھر شروع کی آیات اعلانِ نقض کی (آیات ۱ تا ۶) جو شوال ۹ھ میں نازل ہوئیں۔[۲۸]

یہاں بہ ظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ مولانا تھانوی کے نزدیک آیات ۷ تا ۲۲ ایک ہی موقع پر نازل ہوئی ہیں لیکن آگے آیات کی تفسیر میں انھوں نے تصریح کی ہے کہ ان میں آیات ۷ تا ۱۲ معاہدۂ حدیبیہ کے نقض سے پہلے اور آیات ۱۳ تا ۲۲ معاہدۂ حدیبیہ کے نقض کے بعد اور فتح مکہ سے قبل نازل ہوئی تھیں:

M ! " # $ الخ L کی نسبت نزول قبل الفتح کو تمہید کے فائدۂ دوم میں نقل کر چکا ہوں، اور اس سے اوپر کی آیت میں ﴿ ¬ ® ¯ ° الخ﴾ کے مضمون سے اس کا نزول بھی قبل الفتح و بعد النکث معلوم ہوتا ہے، اور اس سے پہلے اِن نَّكَثُوٓاْ دال ہے نزول قبل النکث پر، پس بدرجۂ اولی فتح مکہ کے قبل اس کا نزول ہوگا، اور اس سے اوپر کی آیتیں اس مضمون کے مناسب ہیں، پس ان سب کا نزول بظنِ غالب قبلِ فتح ہے۔[۲۹]

اس رائے پر قائم ہونے والے اشکالات

یہ رائے قبول کی جائے تو اوپر مذکورہ تمام اشکالات حل ہو جاتے ہیں۔[۳۰] تاہم اس رائے پر بعض اور قوی اشکال قائم ہوتے ہیں۔ ان اشکالات کا ذکر برادرم عمار خان ناصر نے راقم کے نام ایک مکتوب میں کیا، اس لیے یہاں انھی کے الفاظ نقل کیے جاتے ہیں:

۲۸- نفسِ مرجع۔

۲۹- نفسِ مرجع، ۵۱۱۔ مولانا تھانوی نے چوں کہ (* + , - . سے وہی لوگ مراد لیے ہیں جو a b c d e f g h میں مراد تھے، یعنی بنو ضمرہ و بنو مدلج، اس لیے انھوں نے یہاں یہ قرار دیا ہے کو اِن نَّكَثُوٓاْ سے "بظن غالب" معلوم ہوا کہ اوپر کی آیات، یعنی آیات ۷ تا ۲۱، کا نزول قبل الفتح ہوا ہے۔

۳۰- مولانا تھانوی نے اس نادر تحقیق کے آخر میں یہ "التماس" تحریر فرمایا ہے: "ان دو رکوع کی تفسیر میں کئی کئی سال گزرے کہ مجھ کو پریشانی اور خلجان رہتا تھا اور جس قدر میں نے لکھا ہے یہ میری کوشش کا منتہا ہے۔ اگر کسی کی نظر یا ذہن میں اس سے احسن اور اسہل تفسیر گزرے تو وہ اسی کو اختیار کر کے مجھ کو معذور سمجھے اور میری لغزش کے عفو کی دعا کرے۔" (نفسِ مرجع)

اولاً: آیات ۷ تا ۱۲ کا اسلوب یہ بتاتا ہے کہ یہ احکام براءت کے حکم سے موخر اور اس پر متفرع ہیں نہ کہ اس کی تمہید کے طور پر بیان کیے جا رہے ہیں۔ M ! " # $ L کو ایک حکم مبتدا ماننا خاصا مشکل ہے۔ یہ اسلوب یہ تقاضا کرتا ہے کہ اس سے پہلے براءت کا حکم دیا جا چکا ہو اور اب اس پر عمل درآمد کے حوالے سے کچھ نفسیاتی و قلبی موانع کو دور کرنا پیش نظر ہو۔ (۳۱)

ثانیاً: اگر اسے ایک تمہیدی حکم قرار دیا جائے اور مقصود یہ ہو کہ مسلمانوں کو مشرکین کے نقض عہد کی صورت میں ان سے قتال کے لیے پیشگی تیار اور آمادہ کیا جائے تو اس صورت میں یہاں دوسرے مشرکین اور قریش میں فرق کرنا موزوں نہیں رہتا۔ M ! " # $ % & ' ( ) * + , L . - کے الفاظ کا تقاضا یہ ہے کہ باقی مشرکین کے بارے میں اعلان براءت کیا جا چکا ہو، البتہ قریش کے ساتھ کیے گئے معاہدے کی پاس داری کی ہدایت دی جا رہی ہو۔ اگر سر دست کسی کے ساتھ معاہدہ ختم نہیں کیا گیا، بلکہ صرف مسلمانوں کو ذہنی طور پر تیار کرنا اور خاص طور پر قریش کی طرف سے نقض عہد کے خطرے سے انھیں آگاہ کرنا پیش نظر ہے تو پھر یہاں انھیں مستثنیٰ کرنا مقصود کے بالکل الٹ ہے۔ یہ فرق اسی صورت میں قابل فہم ہو سکتا ہے جب یہ مانا جائے کہ عمومی طور پر مشرکین سے معاہدے ختم کرنے کا اعلان کیا جا چکا ہے، البتہ معاہدۂ حدیبیہ کی پاس داری کی ہدایت کی جا رہی ہے تا آنکہ قریش خود اسے توڑ دیں۔ (۳۲)

۳۱۔ اوپر حاشیہ ۱۲ میں علامہ الوسی کی الجھن کا ذکر کیا گیا کہ ایک جانب وہ آیات ۷ تا ۱۲ کو پہلی چھے آیات میں مذکور اعلانِ براءت میں کارفرما حکمت کی توضیح قرار دیتے ہیں اور دوسری طرف اس کے قائل ہو جاتے ہیں کہ آیت ۱۳ و مابعد کا نزول نقض حدیبیہ کے بعد اور فتح مکہ سے قبل ہوا۔

۳۲۔ جیسا کہ اس اشکال سے واضح ہو رہا ہے، عمار صاحب کا رجحان مولانا اصلاحی کی رائے کی طرف ہے اور وہ اس کے قائل ہیں کہ آیات ۱ تا ۱۲ کا نزول نقض حدیبیہ سے قبل ہوا۔ راقم کے نام مکتوب میں انھوں نے اس کی تفصیلی وضاحت کی ہے۔

ثالثاً: آیات ۱ تا ۶ کو نزولاً موخر جب کہ ۷ تا ۱۲ کو مقدم ماننا قرآن کے عام اسلوب سے بھی بالکل ہٹ کر ہے۔ قرآن کا عام اسلوب یہی ہے کہ ایک ہی معاملے سے متعلق الگ الگ نازل ہونے والے احکام کو اگر کسی جگہ اکٹھا رکھا گیا ہے تو ترتیب نزول کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔ اگر ان احکام میں معنوی طور پر تدریج بھی پائی جاتی ہو، جیسا کہ زیر بحث آیات کے حوالے سے مفروضہ صورت ہے، تو پھر اس ترتیب کو ملحوظ رکھنا اور بھی مناسب دکھائی دیتا ہے۔۔۔ موجودہ صورت میں آیات ۱ تا ۶ اور ۷ تا ۱۲ لفظاً ومعناً اس طرح باہم جڑی ہوئی ہیں کہ ان میں فصل کرنا بہت مشکل ہے۔ خارجی صورت حال کی روشنی میں زمانہ نزول کی تعیین کی مشکل درپیش نہ ہو تو نفس متن کو بار بار پڑھنے سے بھی یہی محسوس ہوتا ہے کہ یہ دونوں حصے منطقی طور پر بالکل مربوط ہیں اور پہلے حصے میں براءت کا اعلان جا رہا ہے، جب کہ دوسرے حصے میں اس کی توجیہ اور اس کے مقتضیات پر عمل کی تحریک پیدا کی جا رہی ہے۔

عمار صاحب کے ذکر کردہ یہ تینوں اشکالات نہایت قوی ہیں۔ ان کا ذکر کردہ تیسرا اشکال ایک اور اہم مسئلے کی طرف توجہ دلا رہا ہے۔ قرآن مجید کی کسی آیت کو منسوخ کرنے والی آیت اگر اسی سورت میں رکھی گئی ہے تو موجودہ ترتیب میں بالعموم ناسخ آیت بعد میں رکھی گئی ہے اور منسوخ آیت پہلے رکھی گئی ہے،[۳۳] بلکہ اگر کسی آیت

۳۳۔ سورۃ البقرہ کی آیت ۲۳۴ میں بیوہ کے لیے چار ماہ اور دس دن کی عدت مقرر کی گئی ہے۔ آگے آیت ۲۴۰ میں ایک سال کی مدت کا ذکر ہے۔ دونوں آیات وَ ٱلَّذِينَ يُتَوَفَّوْنَ مِنكُمْ وَيَذَرُونَ أَزْوَٰجًا کے الفاظ سے شروع ہوتی ہیں۔ کئی مفسرین نے قرار دیا کہ دونوں آیات میں عدت کی مدت مقرر کی گئی ہے جو ابتدا میں ایک سال تھی لیکن بعد میں چار ماہ دس دن کر دی گئی۔ (مثال کے طور پر دیکھیے: الجصاص، **أحكام**، ۲: ۱۱۸-۱۱۹۔) گویا موجودہ ترتیب میں ناسخ آیت منسوخ آیت سے پہلے رکھی گئی ہے۔ اس کے برعکس مولانا اصلاحی نے یہ رائے قائم کی کہ آیت ۲۳۴ میں عدت کی مدت مقرر کی گئی ہے جب کہ آیت ۲۴۰ میں بیوہ کے لیے ایک سال کے نفقے کی وصیت لازم کی گئی اور اس وصیت کو بعد میں آیات مواریث نے منسوخ کر دیا جب میت کی بیوی کے لیے ترکے کا چوتھا یا آٹھواں حصہ مقرر کیا گیا۔ (اصلاحی، **تدبر**، ۱: ۵۴۶) بعض قدیم مفسرین نے بھی یہی رائے اختیار کی ہے۔ (مثال کے طور پر مجاہد اور ابو مسلم اصفہانی کے اقوال کی تفصیل کے لیے دیکھیے: امام فخر الدین محمد بن ضیاء الدین الرازی، **مفاتیح الغیب** (بیروت: دار الفکر، ۱۴۰۱ھ / ۱۹۸۱ء)، ۶: ۱۷۰-۱۷۱۔)

کی مزید تبیین بعد میں کسی آیت میں کی گئی ہے جسے اسی سورت میں رکھا گیا ہے[۳۴] تو تبیین کرنے والی آیت بھی موجودہ ترتیب میں موخر رکھی گئی ہے،[۳۵] جب کہ یہاں اگر آیات ۷ تا ۱۲ کا نزول پہلی چھے آیات پر مقدم رکھا جائے تو ماننا پڑتا ہے کہ ناسخ آیت (M فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِينَ حَيْثُ وَجَدتُّمُوهُمْ L موجودہ ترتیب میں منسوخ آیت M0 1 2 3 4 L سے پہلے رکھی گئی ہے۔[۳۶]

۳۴۔ تبیین سے یہاں مراد نسخ کے ماسوا بیان کی وہ ساری قسمیں ہیں جو اصول الفقہ میں ذکر کی جاتی ہیں۔ طویل مدنی سورتوں، جیسے سورۃ البقرہ، سورۃ النساء اور سورۃ النور میں اس کی کئی مثالیں ملتی ہیں جہاں تبیین والی آیت میں يُبَيِّنُ اللہ کے الفاظ آیت کے آخر میں مذکور ہوتے ہیں۔

۳۵۔ بلکہ اس سے بھی آگے بڑھ کر کہا جاسکتا ہے کہ اگر ناسخ آیت کسی اور سورت میں رکھی گئی ہے لیکن وہ سورتوں کے اسی گروپ کا حصہ ہے جس میں منسوخ آیت والی سورت بھی شامل ہے تو اس گروپ میں ناسخ آیت والی سورت منسوخ آیت والی سورت کے بعد رکھی گئی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ گروپ کے اندر سورتوں کی ترتیب میں بالعموم ترتیبِ نزولی کا لحاظ رکھا گیا ہے۔ مثال کے طور پر سورۃ البقرۃ کی آیات ۱۸۰-۱۸۲ میں والدین اور دیگر اقارب کے لیے وصیت فرض کی گئی اور اسی طرح آیت ۲۴۰ میں، جیسا کہ اوپر مذکور ہوا، بیوہ کے لیے ایک سال کے نفقے کی وصیت لازم قرار دی گئی۔ بعد میں سورۃ النسآء کی آیات ۱۱ اور ۱۲ میں والدین، دیگر رشتہ داروں اور بیوہ کے لیے وراثت میں حصے مقرر کیے گئے تو رسول اللہ ﷺ نے اعلان فرمایا کہ اب ورثا کے لیے وصیت ناجائز ہوگئی ہے۔ پھر کچھ عرصے کے بعد وراثت میں کلالہ کے متعلق مزید تبیین اسی سورت کی آخری آیت ۱۷۶ میں پیش کی گئی۔ راقم نے ایک دوسرے مقام پر سورتوں کے گروپ اور نظم قرآن کے اس تصور کی توضیح اور سیرت نگاری پر اس کے اثرات کا جائزہ لیا ہے۔ تفصیل کے طالب وہاں ملاحظہ کریں: محمد مشتاق احمد، "فراہی مکتبِ فکر اور سیرت نگاری"، سہ ماہی **فکر و نظر**، اسلام آباد، ۵۲: ۲ (۲۰۱۴)، ۳۹ – ۶۱۔

۳۶۔ امام طبری اور دیگر کئی مفسرین نے ابن زید کے حوالے سے نقل کیا ہے کہ آیت ۷ میں مذکور حکم کو آیت ۵ نے منسوخ کر دیا ہے۔ "و قد نسخ هذا ، الأشهرُ التي ضربت لهم ، و غدروا بهم فلم يستقيموا كما قال الله ؛ فضرب لهم بعد الفتح أربعة أشهر، يختارون من أمرهم إما أن يسلموا و إما أن يلحقوا بأي بلاد شاءوا. قال: فأسلموا قبل أربعة أشهر، و قبل قتل." (اس حکم کو (چار) مہینوں کی اس مہلت نے ختم کر دیا جو ان کے لیے مقرر کی گئی اور چوں کہ انھوں نے عہد شکنی کی اور عہد پر قائم نہیں رہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا، تو فتح مکہ کے بعد ان کے لیے چار مہینوں کی مدت مقرر کی گئی جس میں انھوں نے اپنے لیے ان دو میں سے کوئی ایک بات چننی تھی کہ اسلام قبول کر لیں یا جس ملک میں جانا چاہیں چلے جائیں۔ پس ان چار مہینوں کی مہلت ختم ہونے اور سزاے موت کی تنفیذ سے قبل ہی انھوں نے اسلام قبول کر لیا۔) (طبری، **جامع البیان**، ۱۴: ۱۴۳)۔ یہ قول، جیسا کہ اوپر مذکور ہوا، تبھی صحیح ہو سکتا ہے

عمار صاحب مولانا اصلاحی رحمۃ اللہ علیہ کے موقف کی طرف رجحان رکھتے ہیں لیکن اوپر ذکر کردہ اشکالات کی روشنی میں وہ موقف بھی ناقابلِ قبول ٹھہرتا ہے۔ پھر اس مسئلے کا حل کیا ہے؟ کیا کوئی ایسی صورت ہو سکتی ہے جس میں قرآن کے الفاظ کو ان کے ظاہری مفہوم سے ہٹانے کی ضرورت بھی پیش نہ آئے، قرآن کے نظم کی رعایت بھی کی جائے، تاریخی طور پر مسلمہ حقائق سے انکار بھی نہ کرنا پڑے اور تفسیری روایات میں اس کے حق میں قوی دلائل بھی پائے جائیں؟

فصلِ چہارم: فتحِ مکہ کے بعد مشرکین کے ساتھ معاہدات

ابتدا کے طور پر اگر درج ذیل امور کو مسلمہ حقائق کے طور پر مان لیا جائے تو ایک مناسب حل کی راہ نکل سکتی ہے:

اولاً: آیات ۱ تا ۱۲ کا نزول بہ یک وقت ہوا (مولانا اصلاحی کی رائے یہی ہے اور نظم قرآن کی رعایت اسی میں رکھی جا سکتی ہے۔)

ثانیاً: ان آیات کا نزول ۹ھ میں ہی ہوا جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا اعلان کروایا (تاریخی روایات اس پر متفق ہیں اور اس صورت میں وہ سنگین فقہی اشکالات بھی وارد نہیں ہوتے جو ۸ھ میں نزول ماننے کی صورت میں لازماً وارد ہوتے ہیں)؛

ثالثاً: ﴿ (* + , - . ﴾ سے مراد قریش کے ساتھ کیا گیا معاہدہ ہی ہے؛

رابعاً: آیت ۱۲ میں M w x y L سے معلوم ہوتا ہے کہ ان آیات کے نزول کے وقت وہ معاہدہ برقرار تھا، جب کہ آیت ۱۳ میں M ¬ ® ¯ ° ± L سے معلوم ہوتا ہے کہ اس آیت و مابعد کا نزول اس وقت ہوا جب دوسرے فریق نے وہ معاہدہ توڑ دیا تھا۔

جب آیات ۷ کا نزول پہلے ہوا ہو اور آیت ۵ کا بعد میں۔ اس کے برعکس اگر آیات ۱ تا ۱۲ کا نزول بیک وقت ہوا ہے تو پھر اس قول کی تاویل یہ ہو گی کہ جب مشرکین سے عام اعلانِ براءت کے بعد یہ لوگ بھی عہد پر قائم نہیں رہے تو ان کا حکم بھی وہی ہوا جو دیگر مشرکین کا تھا، یعنی اشہرِ حرم گزر جانے کے بعد ان کے خلاف جنگ ہونی تھی۔ ان لوگوں کے لیے یہ حکم آگے آیت ۱۳ میں آیا ہے۔ گویا آیت ۱۳ کے نزول کے بعد ان پر آیت ۵ ہی کے حکم کا اطلاق ہونا تھا۔

یہ آخری دو باتیں مولانا تھانوی اور مولانا اصلاحی دونوں مانتے ہیں اور انھیں ماننے کی صورت میں قرآن کے الفاظ کے ظاہری مفہوم سے ہٹنا نہیں پڑتا۔ قدیم مفسرین میں بھی بیش تر نے یہی راے اختیار کی ہے۔ تاہم مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ اور مولانا اصلاحی رحمۃ اللہ علیہ دونوں یہاں معاہدے سے صلحِ حدیبیہ مراد لیتے ہیں، اور یہی اصل الجھن کا سبب ہے! اسی بنا پر مولانا تھانوی کا موقف اختیار کرنے والوں کو نظم کی رعایت چھوڑ دینی پڑتی ہے اور مولانا اصلاحی رحمۃ اللہ علیہ کی راے ماننے والوں کو تاریخی اور فقہی اشکالات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ بہ الفاظِ دیگر اوپر مذکورہ پہلی دو مسلمات میں کسی ایک کو چھوڑنا پڑتا ہے۔

اس کے برعکس اگر اوپر مذکورہ پہلے دونوں مسلمات مانے جائیں تو دیکھنا پڑے گا کہ جب ۹ھ میں آیات ۱ تا ۱۲ کا نزول ہوا تو اس وقت قریش کے ساتھ کیا گیا کون سا معاہدہ ابھی قائم تھا جسے، مولانا اصلاحی رحمۃ اللہ علیہ کے الفاظ میں، ابھی قریش "لشتم پشتم نباہ رہے تھے"؟ ساتھ ہی دیکھنا پڑے گا کہ کیا ان بارہ آیات کے نزول کے بعد وہ معاہدہ توڑ دیا گیا جس کے نتیجے میں آیات ۱۳ و مابعد میں مسلمانوں کو قتال کا حکم دیا گیا؟ ان دو سوالات کے جواب کے لیے تفسیر کے علاوہ سیرت و تاریخ اور فقہ کا ذخیرہ کھنگالنا ضروری ہے۔ یہ بھی واضح ہے کہ یہ مان لینے کی صورت میں، کہ ان آیات کا اطلاق صلحِ حدیبیہ کے بجاے کسی اور معاہدے کے نقض پر ہوتا ہے، تو اس صورت میں بہت سی آیات کی تاویل پر بھی فرق پڑتا ہے۔

مشرکینِ مکہ کی قانونی حیثیت: فتحِ مکہ سے قبل اور فتحِ مکہ کے بعد

معلوم اور مسلمہ حقیقت ہے کہ مسلمانوں کے مقابلے میں مشرکینِ مکہ کی حیثیت "اہلِ حرب" کی تھی[۳۷] اور اس وجہ سے ان کے جان و مال کو قانونی طور پر کوئی تحفظ حاصل نہیں تھا۔[۳۸] جب ۶ھ میں مسلمانوں اور

۳۷- اہلِ حرب سے لازماً یہ مراد نہیں کہ وہ دشمن اور جائز ہدف قرار دیے گئے۔ اس سے مراد صرف یہ ہے کہ دار الاسلام سے باہر موجود رہنے کی وجہ سے ان کو دار الاسلام کے قانونی نظام کی رو سے تحفظ حاصل نہیں تھا۔ اگر یہ اہل حرب، یا حربی، برسرِ جنگ بھی ہوتے تو محاربین کہلاتے اور اگر عارضی معاہدۂ امن (موقتاً یا مطلقاً) کر لیتے تو انھیں اہل صلح یا اہل موادعہ کہا جاتا اور معاہدے کی وجہ سے ان کے جان و مال کو کسی حد تک تحفظ حاصل ہو جاتا۔ البتہ اگر یہ مسلمانوں کے ساتھ ابدی امن کا معاہدہ، عقد ذمہ، کر لیتے تو ان کو اہل ذمہ یا ذمی کہتے اور ان کو قانونی طور پر وہ مکمل تحفظ حاصل ہو جاتا جو دار الاسلام کے مسلمان باشندوں کو حاصل ہوتا۔ تفصیل کے لیے دیکھیے: محمد مشتاق احمد، **جہاد مزاحمت اور بغاوت اسلامی شریعت اور بین الاقوامی قانون کی روشنی میں** (گوجرانوالہ: الشریعہ اکادمی، ۲۰۱۲ء)، ۵۶۱ – ۵۶۳۔

مشرکین کے درمیان حدیبیہ کے مقام پر صلح ہوگئی تو اس صلح نے پہلی دفعہ ان کی قانونی حیثیت میں تبدیلی پیدا کی اور وہ "اہلِ موادعہ" ہوگئے۔ چناں چہ اس امان کے سبب ان کے جان و مال کو کسی حد تک قانونی تحفظ حاصل ہوگیا۔ جب ۸ھ میں مشرکینِ مکہ نے اس صلح کی خلاف ورزی کی اور رسول اللہ ﷺ نے صلح کی تجدید کی پیش کش قبول نہیں کی تو مشرکینِ مکہ کی حیثیت پھر اہلِ حرب کی ہوگئی۔ اب سوال یہ ہے کہ فتحِ مکہ کے بعد اہلِ مکہ کی قانونی حیثیت میں کیا فرق آیا؟

اس سوال کے جواب میں فقہاے کرام نے جو تحقیق کی اس نے ایک اہم قانونی بحث کی شکل اختیار کی جس کا محور یہ امر تھا کہ کیا رسول اللہ ﷺ نے مکہ کو بہ زورِ شمشیر (عنوةً) فتح کیا، یا امن کے معاہدے کے ذریعے (صلحاً)؟ یہاں تفصیل کی گنجائش نہیں ہے۔ اس لیے صرف فقہاے احناف کی راے نقل کی جائے گی کہ مکہ بہ زورِ شمشیر دار الاسلام میں شامل کیا گیا، نہ کہ امن کے معاہدے کے ذریعے۔[۳۹] یہ طے کرنے کے بعد دوسرا اہم مسئلہ فقہاے کرام کے سامنے یہ تھا کہ کیا مکہ کی اراضی پر رسول اللہ ﷺ نے ان احکام کا اطلاق کیا جن کا اطلاق آپ بہ زورِ شمشیر حاصل شدہ علاقوں پر کیا کرتے تھے؟ اس سوال کا جواب نفی میں ہے اور فقہاے کرام مانتے ہیں کہ دیگر مفتوحہ علاقوں کے برعکس مکہ کی اراضی اللہ کے لیے خاص کی گئی اور اس کے لیے رسول اللہ ﷺ نے خصوصی احکام دیے۔[۴۰] ان دونوں امور کے تعین کے بعد اہلِ مکہ کی قانونی حیثیت کا تعین آسان ہوگیا۔

اہلِ مکہ کے ساتھ اہلِ خیبر کی طرح کا معاملہ نہیں کیا جاسکتا تھا؟[۴۱] اس کی ایک وجہ تو مکہ کی خصوصی قانونی حیثیت تھی جو خیبر سے یکسر مختلف تھی اور دوسری بڑی وجہ یہ تھی کہ اہلِ خیبر یہود تھے جن سے صلح کے

۳۸- اس کو قانونی زبان میں "عصمت" کہتے ہیں۔ تفصیل کے لیے دیکھیے: مشتاق احمد، نفسِ مرجع، ۵۶۳- ۵۷۵۔ واضح رہے کہ صلح حدیبیہ سے پہلے بھی اور اس صلح کے ٹوٹ جانے کے بعد بھی بعض افراد کو وقتاً فوقتاً انفرادی امان دی گئی۔

۳۹- اس مسئلے پر تفصیلی بحث کے لیے دیکھیے: السرخسی، **المبسوط**، ۱۰: ۳۷-۴۰۔

۴۰- تفصیل کے لیے دیکھیے: ابو عبید القاسم بن سلام، **کتاب الأموال**، تحقیق ابو انس سید بن رجب (منصورہ: دار الهدی النبوي، ۱۴۲۸ھ/۲۰۰۷ء)، ۱: ۱۲۶-۱۳۵۔

۴۱- اہلِ خیبر ان کی زمین پر اس شرط پر رہنے دیا گیا کہ وہ پیداوار میں سے ایک مقررہ حصہ مسلمانوں کو ادا کریں گے اور مسلمان جب ضرورت محسوس کریں گے تو انھیں ان زمینوں سے بے دخل کر سکیں گے۔ سرخسی، مصدرِ سابق، ۱۰: ۴۰-۴۱؛ ابو عبید، **کتاب الأموال**، ۱: ۱۴۹-۱۵۱۔

عوض میں مال وصول کیا جاسکتا تھا، جب کہ اہلِ مکہ مشرک تھے جن کے لیے حتمی طور پر دو ہی راستے تھے: اسلام یا تلوار، اور ان میں سے انھیں خود ہی کسی ایک کا انتخاب کرنا تھا۔[۴۲] فتحِ مکہ کے موقع پر رسول اللہ ﷺ نے عام معافی کا اعلان کیا اور ابو سفیان رضی اللہ عنہ کے گھر میں داخل ہونے والوں، کعبے میں پناہ لینے والوں اور اپنے گھروں کے دروازے بند کرنے والوں کو امان دی۔[۴۳] جن لوگوں کا لڑنے کا ارادہ تھا ان سے بھرپور طریقے سے نمٹنے کا بھی حکم دیا۔[۴۴] بعض لوگوں کے بارے میں صراحت کی کہ خواہ کعبے کے پردے سے لپٹے ہوئے ہوں، انھیں قتل کر دو۔[۴۵] اس کے بعد آپ نے مسجد حرام میں خطبہ دیا اور جب سارے مجرم سر جھکائے کھڑے تھے تو آپ نے اعلان کیا: "اذهبوا فأنتم الطلقاء" (جاؤ، تم سب آزاد ہو)۔[۴۶] ان اقدامات کا قانونی نتیجہ یہ ہوا کہ اہلِ مکہ کو "غیر موقت امان" مل گئی۔ بہ الفاظِ دیگر، ان کے ساتھ "موادعہ مطلقہ" طے پایا اور اہم بات یہ ہے کہ یہ معاہدہ مسجد حرام میں طے پایا!

اس لحاظ سے دیکھیں تو ﴿ (* + , - . ﴾ کا اطلاق صلح حدیبیہ سے بھی زیادہ واضح طور پر اہلِ مکہ، یا طلقا، کے ساتھ ہونے والے اس معاہدے پر ہوتا ہے جس کا اعلان فتحِ مکہ کے موقع پر ہوا۔[۴۷]

فتحِ مکہ اور اعلانِ براءت کے درمیان

سیرت اور تاریخ کی کتب سے اہلِ مکہ اور دیگر مشرکینِ عرب کے ساتھ فتحِ مکہ کے بعد تعلقات کی مزید تفصیلات بھی ملتی ہیں۔ مثال کے طور پر ام ہانی رضی اللہ عنہا کے پاس قبیلۂ مخزوم کے دو افراد نے پناہ لی جن کو قتل

۴۲۔ حنفی فقہا اس حکم کے لیے بالعموم سورۃ الفتح کی آیت تُقْتَلُونَهُم أَو يُسلِمُونَ کا حوالہ دیتے ہیں۔ سرخسی، مصدرِ سابق، ۱۰: ۱۱۷-۱۱۹۔

۴۳۔ سہیلی، **الروض الأنف**، ۴: ۱۵۷۔

۴۴۔ نفسِ مرجع، ۱۶۳-۱۶۵۔

۴۵۔ نفسِ مرجع، ۱۶۶-۱۶۹۔

۴۶۔ نفسِ مرجع، ۱۷۱۔

۴۷۔ بہ الفاظِ دیگر، آیت ۷ میں الذين عاهدتم من المشركين سے مراد قریش ہی ہیں، لیکن معاہدے سے مراد صلح حدیبیہ نہیں، بلکہ فتحِ مکہ کے بعد دی گئی امان ہے۔

کرنے کے لیے سیدنا علی کرم اللہ وجہہ ان کے پیچھے آئے لیکن ام ہانی رضی اللہ عنہا ان کے سامنے کھڑی ہو گئیں اور کہا کہ پہلے مجھے قتل کر دو تو اس کے بعد ہی انھیں قتل کر سکو گے۔ اس کے بعد انھوں نے آکر یہ واقعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بیان کیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "قد أجرنا من أجرت، و آمنا من أمنت، فلا يقتلهما." (یقیناً ہم نے اسے پناہ دی جسے تم نے پناہ دی اور ہم نے اسے امان دی جسے تم نے امان دی۔ پس وہ اسے قتل نہیں کرے گا۔)[۴۸] اس سے معلوم ہوا کہ ان دونوں کے قتل کا حکم جاری ہو چکا تھا اور اسی لیے سیدنا علی کرم اللہ وجہہ ان کے پیچھے آئے تھے، لیکن اس امان کے بعد ان کی سزاے موت معطل ہو گئی۔[۴۹]

اسی طرح صفوان بن امیہ رضی اللہ عنہ کے بارے میں مذکور ہے کہ وہ مکہ سے فرار ہو گئے تھے لیکن عمیر بن وہب رضی اللہ عنہ نے ان کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے امان حاصل کی اور نشانی کے طور پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں اپنا عمامہ دے دیا۔ وہ صفوان رضی اللہ عنہ کے پاس پہنچے تو وہ کشتی میں سوار ہو کر جانے والے تھے۔ آپ نے انھیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کریمانہ سلوک سے آگاہ کیا اور کہا: "أفضل الناس، و أبر الناس، و أحلم الناس، و خير الناس، ابن عمك، عزه عزك، و شرفه شرفك، و ملكه ملكك. قال: إني أخافه على نفسي. قال : هو أحلم من ذاك و أكرم. (وہ سب لوگوں سے افضل، سب سے زیادہ اپنے قول کے پکے، سب سے زیادہ بردبار اور سب سے اچھے ہیں۔ تمھارے چچازاد ہیں۔ ان کی عزت تمھاری عزت، ان کا شرف تمھارا شرف اور ان کی حکومت تمھاری حکومت ہے۔ اس نے کہا: مجھے ان سے اپنے متعلق سخت سزا کا اندیشہ ہے۔ اس نے جواب دیا: وہ تمھاری توقع سے زیادہ بردبار اور کریم ہیں۔)[۵۰]

یہ سن کر صفوان واپس لوٹے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے حاضر ہوئے تو کہا کہ مجھے عمیر نے کہا ہے کہ آپ نے مجھے امان دی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تصدیق فرمائی تو صفوان نے کہا: "فاجعلني فيه بالخيار

۴۸۔ السہیلی، مرجع سابق، ۴: ۱۶۹۔

۴۹۔ حنفی فقہا اس واقعے سے استدلال کرتے ہیں کہ مسلمان عورت بھی کفار کو امان دے سکتی ہے۔ ابو بکر محمد بن ابی سہل السرخسی، **شرح کتاب السیر الکبیر**، تحقیق حسن اسماعیل الشافعی (بیروت: دار الکتب العلمیة، ۱۹۹۷)، ۱: ۲۵۵۔

۵۰۔ السہیلی، مرجع سابق، ۴: ۱۸۰۔

شھرین" (تو مجھے اس بارے میں فیصلہ کرنے کے لیے دو مہینے دے دیجیے) ۔ اس پر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "أنت بالخیار فیه أربعة أشهر" (تم اس بارے میں چار مہینوں میں فیصلہ کر سکتے ہو)۔[۵۱]

سوال یہ ہے کہ یہ خیار صفوان رضی اللہ عنہ کس معاملے میں مانگ رہے تھے؟ ظاہر ہے کہ انھیں معلوم تھا کہ ان کے سامنے اسلام یا تلوار میں سے کسی ایک کا اختیار تھا، الا یہ کہ وہ جزیرۂ عرب سے نکل جاتے، اور اسی لیے وہ نکلنے کے لیے جارہے تھے۔ اب جب ان کو امان ملی تو اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انھیں جزیرۂ عرب میں عارضی قیام کی رخصت مل گئی۔ انھوں نے فیصلے کے لیے دو مہینے مانگے تو رسول اللہ ﷺ نے انھیں چار مہینے دیے۔ انھوں نے اس مقررہ مدت کے اختتام سے قبل ہی اسلام قبول کر لیا تھا۔

رمضان ۸ھ میں فتح مکہ کے بعد ہوازن نے لشکر جمع کر کے مسلمانوں کا مقابلہ کرنے کی ٹھان لی۔[۵۲] چناں چہ رسول اللہ ﷺ نے شوال ۸ھ میں ہوازن کا رخ کیا۔ ثقیف کے تمام قبائل، نیز جشم، سعد بن بکر اور بنی ہلال اس جنگ میں ہوازن کا ساتھ دے رہے تھے۔[۵۳] یہ گویا مشرکینِ عرب کی جانب سے جوابی اقدام (Couner Revolution) کی ایک بھرپور کوشش تھی۔ اس معرکے کی اسی اہمیت کے سبب قرآن مجید نے اعلان براءت کی آیات میں اس کا خصوصی ذکر کیا ہے اور مسلمانوں کو اپنی نصرت کی نشانیاں یاد دلائی ہیں۔[۵۴] اس معرکے میں فتح کے بعد رسول اللہ ﷺ نے مشرکینِ عرب کے دوسرے بڑے صنم کدے – طائف – کا رخ کر کے اس کا محاصرہ کیا۔[۵۵] طائف کی اہمیت صرف اس وجہ سے ہی نہیں تھی کہ مکہ کے بعد یہ دوسرا بڑا شہر تھا بلکہ

۵۱– السہیلی، مرجعِ سابق۔ صفوان رضی اللہ عنہ کے اسلام قبول کرنے سے قبل اسی عارضی امان کے دور میں ہوازن کی جنگ کا موقع آیا تو رسول اللہ ﷺ نے صفوان رضی اللہ عنہ سے زرہیں عاریتاً مانگ لیں۔ صفوان رضی اللہ عنہ کے دل میں ابھی بھی خدشات تھے۔ چناں چہ آپ نے پوچھا: اغصباً، یا محمد! (اے محمد ﷺ کیا یہ آپ جب غصب کے طور پر لے رہے ہیں؟) اس پر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "بل عاریة و مضمونة حتی نؤدیها إلیک. "(نہیں، بلکہ یہ عاریہ ہے اور ہم پر انھیں تم تک لوٹانے کی ذمے داری ہو گی۔) نفسِ مرجع، ص۲۰۸۔ ہوازن کے غنائم میں سے رسول اللہ ﷺ نے صفوان رضی اللہ عنہ کو بطور تالیفِ قلب سو اونٹ دیے۔ نفسِ مرجع، ص۲۷۰۔

۵۲– نفسِ مرجع، ۲۰۵۔

۵۳– نفسِ مرجع۔

۵۴– القرآن ۹: ۲۵۔

۵۵– السہیلی، مرجعِ سابق، ۴: ۲۴۹۔

اسے قریش کے گرمائی دارالخلافہ (Summer Capital) کی حیثیت بھی حاصل تھی اور یہاں اہلِ مکہ کی جاے داد بھی تھی۔ نیز اہلِ مکہ اور اہلِ طائف کے درمیان رشتے داریاں بھی تھیں۔[۵۶] رسول اللہ ﷺ نے کچھ عرصہ طائف کا محاصرہ کیے رکھا اور پھر محاصرہ ختم کرکے واپس چلے گئے۔[۵۷] پس اہلِ طائف کی حیثیت بہ دستور اہلِ حرب ہی کی رہی۔ جعرانہ کے مقام پر، جہاں سے دار الاسلام کی حدود شروع ہوتی تھیں، غنائم کی تقسیم کے بعد رسول اللہ ﷺ مدینہ منورہ تشریف لے گئے۔[۵۸]

باقی عرب مشرکین کو اہلِ مکہ کی طرح عارضی امان حاصل ہوگئی تھی اور عموماً یہ امان غیر موقت تھی، یعنی اس میں وقت کی قید ذکر نہیں کی گئی تھی۔ بعض افراد اور قبائل کے ساتھ موقتاً بھی عقد امان طے پایا۔[۵۹] ان خصوصی عقودِ امان کے علاوہ ایک عمومی امان تمام عرب کو صراحتاً یا دلالتاً مل گئی جسے مفسرین اور سیرت نگار "العهد العام" سے تعبیر کرتے ہیں اور اس عام معاہدے کی رو سے تمام عربوں کے لیے مسجدِ حرام آنے کا حق تسلیم کیا گیا تھا اور ساتھ ہی یہ بات مان لی گئی تھی کہ ان پر حملہ نہیں کیا جائے گا۔[۶۰]

۵۶- مثال کے طور پر غزوۂ طائف کے ضمن میں سیرت نگار ذکر کرتے ہیں کہ ابوسفیان رضی اللہ عنہ کی بیٹی آمنہ کا نکاح چوں کہ طائف کے سردار عروہ بن مسعود کے ساتھ ہوا تھا اس لیے ابوسفیان امان کا پیغام لے کر گئے تاکہ انھیں جنگ کے اثرات سے بچا سکیں۔ السہیلی، مرجعِ سابق، ص ۲۵۶۔

۵۷- محاصرے کی مدت بیس دن سے کچھ کم یا زیادہ تھی۔ مرجعِ سابق، ۲۵۴-۲۵۵۔

۵۸- چناں چہ روایات میں آتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے غنائم تقسیم کرنے سے انکار کیا جب تک آپ جعرانہ پہنچ نہیں گئے۔ اس سے فقہا یہ ثابت کرتے ہیں کہ غنائم کی تقسیم دار الاسلام میں ہی کرنی چاہیے اور اس وقت دار الاسلام کی حدود جعرانہ سے ہی شروع ہوتی تھیں۔ تفصیل کے لیے دیکھیے: السرخسی، **المبسوط**، ۱۰: ۱۸-۱۹۔

۵۹- مثال کے طور پر بنی ضمرہ و بنی مدلج کے معاہدے کا ذکر مفسرین کرتے ہیں جس کی مدت میں اعلانِ براءت کے وقت بھی نو مہینے باقی تھے۔

۶۰- السہیلی، **الروض**، ۴: ۳۱۸-۳۱۹۔ امام طبری نے بھی یہی بات سیرت ابن اسحاق کے حوالے سے ذکر کی ہے۔ الطبری، **جامع**، ۱۴: ۹۶-۹۷۔

اس سارے پس منظر میں جب رسول اللہ ﷺ کو اہلِ کتاب، بالخصوص رومی نصاری، سے جنگ کا حکم ہوا اور آپ نے رجب ۹ھ میں تبوک کی طرف رخ کیا،[۶۱] تو اچانک ہی گویا جاہلیت کے علم برداروں کو کھل کر سامنے آنے کا موقع ملا۔ تاریخ کے اس انتہائی نازک موڑ پر، جب کہ ایک طرف مسلمانوں کو وقت کی سب سے بڑی سیاسی طاقت، بازنطینی سلطنت، سے لڑائی درپیش تھی اور دوسری طرف مدینہ منورہ میں منافقین نے سیدنا علی کرم اللہ وجہہ کے خلاف ریشہ دوانیاں شروع کیں،[۶۲] مشرکینِ عرب نے بھی۔ جنھیں اسلام یا تلوار میں کسی کا ایک کا انتخاب کرنا تھا اور جنھیں عام یا خاص معاہدے کی وجہ سے امان حاصل تھی - موقع غنیمت جان کر عہد شکنی شروع کی۔ امام فخر الدین الرازی (م ۶۰۴ھ / ۱۲۰۷ء) سورۃ التوبۃ کی تفسیر کی ابتدا میں واضح فرماتے ہیں: "روي أن النبي ﷺ لما خرج إلى غزوة تبوک، و تخلف المنافقون و أرجفوا بالأراجيف، جعل المشرکون ينقضون العهد، فنبذ رسول الله ﷺ العهد إليهم." (روایت کی گئی ہے کہ جب نبی ﷺ غزوۂ تبوک کے لیے نکلے اور منافقین نے پیچھے رہ کر ریشہ دوانیاں کیں تو مشرکین نے معاہدات توڑنے شروع کیے۔ اس بنا پر رسول اللہ ﷺ نے ان کے ساتھ معاہدات ختم ہونے کا اعلان کیا۔)[۶۳]

یہ گویا تقریباً اسی طرح کی صورتِ حال تھی جس کا سامنا مسلمانوں کو رسول اللہ ﷺ کے وصال کے فوراً بعد کرنا پڑا جب ایک طرف اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ کی سربراہی میں شام کی طرف لشکر روانہ ہو رہا تھا اور دوسری طرف جزیرۂ عرب میں ارتداد کی آگ پھیل گئی۔ پھر سیدنا ابو بکر رضی اللہ عنہ نے وہی کیا جو اس موقع پر رسول اللہ ﷺ نے کیا اور جس کا ذکر آگے آرہا ہے۔

۶۱- راقم کی تحقیق یہ ہے کہ غزوۂ تبوک کے لیے جانے کا حکم سورۃ التوبہ کی آیت ۲۹ میں دیا گیا ہے جس نے مسلمانوں پر لازم کیا کہ وہ اہلِ کتاب سے اس وقت تک لڑیں جب تک وہ جزیہ دینے کی ذمہ دار نہ اٹھائیں۔ اس موضوع پر ایک الگ مقالے میں تفصیلی بحث کی گئی ہے جو ابھی منتظر طبع ہے۔

۶۲- السہیلی، مرجع سابق، ۴: ۲۹۵۔ مولانا مودودی نے اس صورتِ حال کی وضاحت ان الفاظ میں کی ہے: "اس موقع کی نزاکت کو سبھی محسوس کر رہے تھے۔ جاہلیتِ قدیمہ کے بچے کھچے عاشقوں کے لیے یہ ایک آخری شعاعِ امید تھی اور روم و اسلام کی اس ٹکر کے نتیجے پر وہ بے چینی کے ساتھ نگاہیں لگائے ہوئے تھے کیوں کہ وہ خود بھی جانتے تھے کہ اس کے بعد پھر کہیں سے امید کی جھلک نہیں دکھائی دینی ہے۔" (مودودی، **تفہیم**، ۲: ۱۶۹-۷۰۔)

۶۳- الرازی، **مفاتیح**، ۱۵: ۲۲۶۔

تبوک کی کامیاب مہم سے عرب مشرکین اور منافقین کو سخت مایوسی کا سامنا کرنا پڑا جس کے نتیجے میں اکثر نے اسلام کا لبادہ اوڑھ لینے میں ہی عافیت سمجھی لیکن بعض کے دلوں میں کینہ بہ ہر حال موجود رہا۔[۶۴] اس کا اظہار اہلِ طائف کی جانب سے مذاکرات میں بھی ہوا جب انھوں نے اپنے صنم کدے اور جاہلیت کے دوسرے شعائر، بالخصوص سود، کو بچانے کی کوشش کی اور نماز کی پابندی اٹھانے کے لیے بھی کہا لیکن بالآخر بیعت پر آمادہ ہوئے۔[۶۵] واضح رہے کہ اہلِ طائف نے مسلمانوں کے آگے سر جھکانے میں عافیت تبھی سمجھی جب مسلمان تبوک سے کامیاب مہم کے بعد واپس آئے اور اسی لیے یہ معاملہ رمضان ۹ھ میں طے پایا۔

اسی تاریخی پس منظر میں آیاتِ براءت کا نزول ہوا۔ رسول اللہ ﷺ نے امیر الحج کی ذمہ داری سیدنا ابو بکر رضی اللہ عنہ کو سونپی اور ان کی قیادت میں مسلمانوں کو حج کے لیے روانہ کیا لیکن براءت کے اعلان کی ذمہ داری سیدنا علی کرم اللہ وجہہ کے سپرد کی۔[۶۶] کئی تفسیری روایات میں آیا ہے کہ براءت کی پہلی آیت میں مشرکین کے ساتھ کیے گئے عام معاہدے کے خاتمے کا اعلان کیا گیا ہے۔ چناں چہ مثال کے طور پر امام طبری نے سورۃ التوبۃ کی پہلی آیت میں مذکور ٱلَّذِينَ عَٰهَدتُّم مِّنَ ٱلْمُشْرِكِينَ کی تشریح میں ابنِ اسحاق کی روایت نقل کی ہے جو قرار دیتے ہیں کہ یہاں مراد عام مشرکین کے ساتھ کیا گیا "عہدِ عام" ہے۔

نزلت سورة براءة في نقض ما بين رسول الله ﷺ و بين المشركين من العهد الذي كانوا عليه في ما بينهم و بينه : ألا يصد عن البيت أحد جاءه ، و ألا يخاف أحد في الشهر الحرام. و كان ذلک عاماً بينه و بين الناس من أهل الشرک.

۶۴- مولانا مودودی کا تجزیہ نہایت بر محل ہے: "تبوک کی اس فتح بلا جنگ نے عرب میں ان لوگوں کی کمر توڑ دی جو اب تک جاہلیتِ قدیمہ کے بحال ہونے کی آس لگائے بیٹھے تھے خواہ وہ علانیہ مشرک ہوں یا اسلام کے پردے میں منافق بنے ہوئے ہوں۔ اس آخری مایوسی نے ان میں سے اکثر وہ بیش تر کے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہ رہنے دیا کہ اسلام کے دامن میں پناہ لیں زاور اگر خود نعمتِ ایمانی سے بہرہ ور نہ بھی ہوں تو کم از کم ان کی آئندہ نسلیں بالکل اسلام میں جذب ہو جائیں۔" مودودی، مرجعِ سابق، ۲: ۱۷۱۔

۶۵- السہیلی، **الروض**، ۴: ۳۱۳-۳۱۸۔

۶۶- اس کی وجہ روایات میں یہ ذکر کی گئی ہے کہ عرب دستور کے موافق معاہدات سے براءت کا اعلان خاندان کے فرد کے ذریعے کرنا تھا۔ اسی وجہ سے اعلان تو سیدنا علی کرم اللہ وجہہ کے ذریعے کرایا گیا لیکن حج کے تمام مناسک سیدنا ابو بکر رضی اللہ عنہ کی امارت میں ہی سرانجام پائے۔

(سورت براءت اس عہد کے خاتمے کے سلسلے میں نازل ہوئی جو رسول اللہ ﷺ اور مشرکین کے درمیان ہوا تھا: کہ کسی کو بیت اللہ آنے سے نہیں روکا جائے گا اور کسی پر حرمت کے مہینے میں حملہ نہیں کیا جائے گا۔ یہ آپ کے اور تمام اہل شرک کے درمیان عام عہد تھا۔) (۶۷)

اس روایت میں آگے آتا ہے کہ اس عہدِ عام کے علاوہ رسول اللہ ﷺ نے بعض مشرکین قبائل کے ساتھ خاص عہود بھی کیے تھے لیکن جب آپ تبوک کے لیے گئے تو ان میں کئی لوگوں نے عہد شکنی کی۔ چناں چہ یہ سورت ان کے بارے میں اور ان منافقین کے بارے میں نازل ہوئی جو تبوک کے موقع پر پیچھے رہ گئے تھے۔ "فكشف الله فيها سرائر أقوام كانوا يستخفون بغير ما يظهرون، منهم من سمى لنا، و منهم من لم يسم لنا." (پس اللہ نے ان گروہوں کے راز کھول دیے جو بہ ظاہر جو کچھ کرتے تھے اس کے برعکس دلوں میں چھپاتے تھے۔ ان میں سے بعض کا نام اس نے ہمیں بتادیا اور بعض کا نہیں بتایا۔) (۶۸)

یہ نہایت اہم بات ہے۔ اس عام معاہدے کے خاتمے کا نتیجہ صرف یہ نہیں تھا کہ مشرکینِ عرب کو حاصل امان ختم ہوگئی بلکہ یہ بھی تھا کہ ان کے لیے مسجدِ حرام میں داخلہ ممنوع ہوگیا۔(۶۹) اگرچہ عام طور پر مفسرین اس روایت کا ذکر کرتے ہیں جس میں کہا گیا ہے کہ سیدنا علی کرم اللہ وجہہ نے تیس یا چالیس آیات اس موقع پر سنائیں لیکن امام مجاہد کی وہ روایت راجح لگتی ہے جس میں ہے کہ آپ نے تیرہ آیات کی تلاوت فرمائی۔(۷۰) چناں چہ اگر تیرہ کے عدد کو راوی کا سہو مانا جائے، یا اس نے ایسا تخمیناً کہا ہو، اور سورۃ التوبۃ کے ابتدائی حصے کی ایک بار پھر تدبر کے ساتھ تلاوت کی جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ پہلی بارہ آیات کا نزول بہ یک وقت ہوا اور سیدنا علی کرم اللہ وجہہ نے انھی کی تلاوت فرمائی!

اس بات کی مزید تائید اس امر سے بھی ہوتی ہے کہ روایات کے مطابق سیدنا علی کرم اللہ وجہہ نے صرف آیات کی تلاوت ہی نہیں فرمائی بلکہ اعلانِ براءت کا خلاصہ بھی چار احکام کی صورت میں ان کے سامنے رکھ دیا:

۶۷- الطبری، **الجامع**، ۱۴: ۹۶۔

۶۸- نفسِ مصدر، ۹۷۔

۶۹- یہی بات آگے آیت ۲۸ میں صراحتاً کہی گئی ہے لیکن یہاں مقصود اس بات کی وضاحت ہے کہ یہ ممانعت آیت اسے بھی ثابت تھی۔

۷۰- الرازی، **مفاتیح**، ۱۵: ۲۲۶۔

فقال : يا أيها الناس! إني رسول رسول الله إليكم. فقالوا: بماذا؟ فقرأ عليهم ثلاثين أو أربعين آية. و عن مجاهد: ثلاث عشر آيات. ثم قال: أمرت بأربع: أن لا يقرب هذا البيت بعد هذا العام مشرک؛ و لا يطوف بالبيت عريان ؛ و لا يدخل الجنة إلا كل نفس مؤمنة؛ و ان يتم الى كل ذى عهد عهده.

پس آپ نے کہا: اے لوگو! میں تمھارے لیے رسول اللہ ﷺ کا نمائندہ بن کر آیا ہوں۔ انھوں نے پوچھا: کس پیغام کے ساتھ؟ تو آپ نے تیس یا چالیس آیات تلاوت فرمائیں۔ البتہ مجاہد سے روایت ہے کہ تیرہ آیات کی تلاوت فرمائی۔ پھر کہا: مجھے چار کاموں کے اعلان کا حکم دیا گیا ہے: کہ اس سال کے بعد کوئی مشرک اس گھر کے قریب نہیں آئے گا؛ کوئی اس گھر کا ننگے بدن طواف نہیں کرے گا؛ جنت میں صرف وہ تمام لوگ ہی داخل ہوں گے جو ایمان والے ہیں؛ اور جو عہد پر قائم ہے تو اس کے ساتھ عہد پورا کیا جائے گا۔[۷۱]

جیسا کہ مذکور ہوا، ان میں پہلی بات براءت کی پہلی آیت سے معلوم ہوتی ہے؛ دوسری بات اسی پہلی بات کا لازمی نتیجہ تھی۔ تیسری بات آیت ۵ اور آیت ۱۱ سے معلوم ہوتی ہے جن میں تصریح کی گئی ہے کہ نجات کا راستہ صرف ایمان ہی کا ہے؛ اور چوتھی بات آیت ۴ اور آیت ۷ سے معلوم ہوتی ہے جن میں ان معاہدین کے ساتھ معاہدہ برقرار رہنے کا اعلان کیا گیا جنھوں نے عہد شکنی کا ارتکاب نہیں کیا تھا، نہ ہی مسلمانوں کے خلاف کسی سازش میں حصہ لیا تھا۔[۷۲]

۷۱- نفسِ مصدر۔

۷۲- بعض روایات میں موقت معاہدات کے متعلق مذکور ہے کہ وہ مقررہ مدت تک برقرار رہیں گے، جب کہ بعض میں مذکور ہے کہ یہ معاہدات چار مہینوں کے بعد ختم ہو جانے تھے۔ اس پر تفصیلی بحث کی یہاں گنجایش نہیں ہے۔ البتہ امام جصاص کی یہ وضاحت یہاں نقل کی جاتی ہے: "و جائز أن يكون المعنيان صحيحين، و أن يكون جعل أجل بعضهم إلى أربعة أشهر، أو تمام أربعة أشهر التي هي أشهر الحرم؛ و جعل أجل بعضهم إلى مدته، طالت المدة أو قصرت." (الجصاص، **أحكام القرآن**، ۴: ۲۶۶۔) اس کے بعد وہ قرار دیتے ہیں کہ اول الذکر حکم آیت ۳ میں مذکور چار مہینوں کی مہلت سے مستنبط ہے اور ثانی الذکر حکم آیت ۷ سے مستنبط ہے جس میں کہا گیا کہ جو لوگ معاہدات پر قائم ہیں ان کے ساتھ معاہدات مقررہ مدت تک برقرار رہے گا۔ گویا یہ دو مختلف قسم کے لوگوں کے لیے دو مختلف احکام تھے۔

اعلانِ براءت میں مشرکینِ مکہ کے لیے استثنا

یہاں سوال یہ پیدا ہو سکتا ہے کہ جب مشرکینِ عرب سے عمومی طور پر براءت کا اعلان کیا گیا تو قریش کو اس سے مستثنیٰ کیوں قرار دیا گیا؟ عمار ناصر صاحب نے راقم کے نام مکتوب میں اس استثنا کی ممکنہ علت کی وضاحت ان الفاظ میں کی تھی:

> قریش چوں کہ حرم میں تھے جہاں قتل وغارت سے حتی الامکان اجتناب پہلی ترجیح تھا، اس لیے حکمت عملی کے لحاظ سے اس کو بہتر سمجھا گیا کہ عرب کے باقی مشرکین کی قوت کو توڑ کر اسلام کی طاقت کی ایک عمومی فضا قائم کر دی جائے جس میں مشرکین قریش کا جذبہ مزاحمت بھی کمزور پڑ جائے اور وہ بہ آسانی سر تسلیم خم کرنے کو تیار ہو جائیں۔ حدیبیہ کے موقع پر قریش کے ساتھ گفت گو میں یہ نکتہ باقاعدہ ان کے ساتھ زیر بحث آیا تھا۔ معاہدہ حدیبیہ سے آپ مسلمانوں کی قوت اور توجہ کو یکسو کر کے قریش کے علاوہ دیگر مشرک قبائل کی سرکوبی کے لیے مرکوز کرنا چاہتے تھے۔ چناں چہ آپ نے قریش کو معاہدۂ صلح کی پیش کش کرتے ہوئے یہ بات کوئی لگی لپٹی رکھے بغیر ان پر صاف واضح کر دی کہ یہ صلح مستقل بقاے باہمی کی غرض سے نہیں، بلکہ محض فریقین کی مصلحت کے لحاظ سے عارضی طور پر کی جا رہی ہے۔

واضح رہے کہ عمار صاحب کی راے، مولانا اصلاحی کی اتباع میں، یہ ہے کہ ان آیات کا نزول حدیبیہ کے معاہدے کے ٹوٹنے سے قبل ہوا اور وہ اسی سیاق میں یہ دلیل دے رہے تھے۔ تاہم یہ دلیل فتح مکہ کے بعد کے حالات میں بھی صحیح معلوم ہوتی ہے کیوں کہ، جیسا کہ اوپر مذکور ہوا، فتح مکہ کے بعد رسول اللہ ﷺ نے یہی حکمتِ عملی اپنائی۔ چناں چہ آپ نے مشرکینِ مکہ کو امان دی اور اس کے نتیجے میں ان میں بیش تر نے اسلام قبول کیا لیکن جو شرک پر قائم رہے آپ نے ان سے بھی تعرض نہیں کیا اور ہوازن و ثقیف کی طرف رخ کیا۔ مزید یہ کہ قریش میں کئی لوگوں نے اس معاملے کو اس زاویے سے بھی دیکھا کہ ان کے خاندان کو اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کے ذریعے پھر عزت دے دی ہے، جیسا کہ اوپر عمیر بن وہب رضی اللہ عنہ کے حوالے سے ذکر کیا گیا کہ آپ نے صفوان رضی اللہ عنہ سے کہا: ابن عمک ، عزه عزک ، و شرفه شرفک ، و ملکه ملکک۔ (تمھارے چچازاد ہیں ۔ ان کی عزت تمھاری عزت، ان کا شرف تمھارا شرف اور ان کی حکومت تمھاری حکومت ہے۔)[۷۳] چناں چہ فتح مکہ کے بعد قریش کا رویہ بالعموم معاندانہ نہیں رہا۔ یہ الگ بات ہے کہ ان میں کچھ جاہلیت کے پروانوں کو یہ بھی ہضم نہ ہو رہا ہو اور وہ موقع کی تلاش میں رہے ہوں۔ یہ زیادہ تر مذہبی پروہت تھے جن کے مالی مفادات بھی جاہلیت کے

۷۳۔ السہیلی، **الروض**، ۴: ۱۸۰۔ بعض روایات میں ابوسفیان رضی اللہ عنہ کے بارے میں بھی اسی طرح کی بات نقل ہوئی ہے، بلکہ طائف کے سرداروں کے بارے میں بھی آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ رشتے داری کا خیال انھیں آیا۔

شعائر سے وابستہ تھے اور جو ان جاہلی رسوم کی بنا پر بزرگی کے زعم میں بھی مبتلا تھے۔ چناں چہ ایسے ہی لوگوں کے بارے میں قرآن نے اس موقع پر واضح فرمایا کہ یہ اگر تم پر غالب آجائیں تو رشتے کا خیال رکھیں گے، نہ ہی معاہدے کی پاس داری کریں گے، اور یہ کہ انھوں نے اللہ تعالیٰ کی آیات کے مقابلے میں متاعِ دنیا کو ترجیح دی ہے۔[۷۴] انھی کو قرآن نے "کفر کے پیشوا" قرار دیا۔[۷۵] دلوں میں انھوں نے جو بغض چھپا رکھا تھا حج کے موقع پر اعلانِ براءت کے وقت وہ بالکل عیاں ہو کر سامنے آگیا!

اعلانِ براءت پر کفر کے پیشواؤں کا ردعمل

جب سیدنا علی کرم اللہ وجہہ نے سورۃ التوبۃ کی پہلی بارہ آیات تلاوت فرمائیں اور مشرکین تک براءت کا اعلان پہنچا دیا تو کیا کفر کے ان پیشواؤں نے یہ بات ٹھنڈے پیٹوں قبول کی؟ کیا جاہلیت کے علم بردار اچانک ہی جاہلیت سے دست بردار ہو گئے اور سر جھکا کر دائرۂ اسلام میں داخل ہو گئے؟ ہرگز نہیں، بلکہ ان کا کینہ اور بغض اچانک ہی کھل کر سامنے آگیا اور انھوں نے کھل کر اعلانِ جنگ کیا۔ امام رازی نے تصریح کی ہے کہ جب سیدنا علی کرم اللہ وجہہ نے ان کے سامنے آیات تلاوت کیں اور پھر چار اعلانات کیے تو انھوں نے کہا: "یا علی! ابلغ ابن عمک انا قد نبذنا العهد وراء ظهورنا، و انه ليس بيننا و بينه عهد الا طعن بالرماح و ضرب بالسيوف." (اے علی! اپنے چچازاد بھائی تک ہماری طرف سے یہ بات پہنچا دو کہ ہم نے معاہدات پیٹھ پیچھے پھینک دیے ہیں اور یہ کہ ہمارے اور اس کے درمیان کوئی عہد باقی نہیں رہا؛ اب بس تیروں کے ذریعے زخمی کرنا اور تلواروں کے ذریعے گردن اڑانا ہی ہے۔)[۷۶]

یہ باقاعدہ اعلانِ جنگ تھا اور اس جنگ کی نوعیت بالکل وہی تھی جو رسول اللہ ﷺ کے وصال کے بعد سیدنا ابو بکر رضی اللہ عنہ کو لڑنی پڑی۔ گویا جاہلیت اپنی بقا کی جنگ لڑ رہی تھی۔

۷۴- القرآن ۹: ۸-۱۰۔

۷۵- القرآن ۹: ۱۱۔

۷۶- الرازی، **مفاتیح**، ۱۵: ۲۲۶۔

یہی روایت امام ابو حیان نے **البحر المحیط** میں اور علامہ زمخشری نے **کشاف** میں ذکر کی ہے۔[۷۷] ابو زکریا یحیٰ بن زیاد الفراء(۲۰۷ھ / ۸۲۲ء) نے، جن کی **معانی القرآن** ابتدائی دور کے اہم تفسیری ذخیرے میں شمار کی جاتی ہے، جس طرح مختصر مگر جامع انداز میں سورۃ التوبۃ کی ابتدائی آیات کی تاویل بیان فرمائی ہے وہ بعینہ اسی موقف پر مبنی ہے:

و المعنی فی قوله (براءة): ان العرب کانوا قد اخذوا ینقوضون عهوداً کانت بینهم و بین النبیﷺ ، فنزلت علیه آیات من اول براءة، امر فیها بنبذ عهودهم الیهم ، و ان یجعل الاجل بینه و بینهم اربعة اشهر. فمن کانت مدته اکثر من اربعة اشهر، حطه الی اربعة؛ و من کانت مدته اقل من اربعة اشهر، رفعه الی اربعة.

ارشاد باری تعالیٰ: "براءۃ" کا مفہوم یہ ہے: کہ عرب نے وہ معاہدات توڑنے شروع کر دیے تھے جو انھوں نے نبی ﷺ کے ساتھ کیے تھے جس پر براءت کی ابتدائی آیات نازل ہوئیں۔ ان آیات میں حکم دیا گیا کہ ان کے معاہدات ان کی طرف پھینک دیے جائیں اور انھیں چار مہینوں کی مہلت دی جائے۔ پس جن معاہدات کی مدت چار مہینوں سے زائد تھی انھیں کم کر کے چار مہینے کر دیا گیا اور جن کی مدت چار مہینوں سے کم تھی انھیں بڑھا کر چار مہینے کر دیا۔[۷۸]

آگے تیسری آیت کی تفسیر میں (وَأَذَٰنٌ مِّنَ ٱللهِ) کے متعلق فرماتے ہیں کہ یہ (بَرَآءَةٌ) کے تابع ہے: "و جعل لمن لم یکن له عهد خمسین یوماً اجلاً." (اور جن کے ساتھ کوئی خصوصی معاہدہ نہیں ہوا تھا انھیں پچاس دن کی مہلت دی گئی۔)[۷۹]

۷۷- شرف الدین الحسین بن عبد اللہ الطیبی، **فتوح الغیب في الکشف عن قناع الریب و هو حاشیة الطیبي علی الکشاف للعلامة جار الله الزمخشري**، تحقیق حمزة محمد وسیم البکری (دبی: جائزة دبي الدولیة للقرآن الکریم، ۱۴۳۴/ ۲۰۱۳)، ۷: ۱۶۶-۱۶۷؛ ابو حیان، **البحر المحیط**، ۵: ۹۔

۷۸- ابو زکریا یحیٰ بن زیاد الفراء، **معاني القرآن** (بیروت: عالم الکتب، ۱۴۰۳ھ / ۱۹۸۳ء)، ۱: ۴۲۰۔

۷۹- نفسِ مصدر، مفسرین میں اس مسئلے پر بھی کافی اختلاف ہے کہ کیا مشرکین کے سب گروہوں کو چار مہینوں کی مہلت دی گئی تھی یا بعض کو چار مہینوں کی اور بعض پچاس دن کی مہلت دی گئی۔ اسی طرح بعض نے اشہر حرم سے معروف حرمت کے مہینے ہی مراد لیے ہیں جب کہ بعض نے اس سے مہلت کے چار مہینے مراد لیے ہیں۔ اس مسئلے پر تفصیلی بحث اس مقالے کی حدود سے باہر ہے۔ ایک اور مقالے میں جو منتظرِ طبع ہے، ہم نے اس مسئلے پر تفصیلی بحث کی ہے۔

اسی طرح امام طبری نے آیت ۷ میں مذکور ﴿ (* + , - . ﴾ کی وضاحت میں ایک جانب ابن عباس رضی اللہ عنہما کا یہ قول نقل کیا ہے کہ یہاں مراد قریش ہیں اور دوسری جانب انھی سے یہ وضاحت بھی نقل کی ہے:" هم قوم كان بينهم و بين رسول الله ﷺ مدة، و لا ينبغى لمشرک ان يدخل المسجد الحرام، و لايعطى المسلم الجزية." (یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے رسول اللہ ﷺ سے ایک مقررہ مدت تک کے لیے معاہدہ کیا تھا۔ البتہ کسی مشرک کے لیے جائز نہیں تھا کہ وہ مسجد حرام میں داخل ہو، نہ ہی وہ مسلمان کو جزیہ دے سکتا تھا۔)(۸۰)

اس روایت میں یہ آخری ٹکڑا نہایت اہم ہے۔ قریش کے ساتھ معاہدے کے بعد بھی ان سے جزیہ نہیں لیا جاسکتا تھا، نہ ہی انھیں دار الاسلام میں مستقل سکونت کی اجازت دی جاسکتی تھی، کیوں کہ وہ مشرک تھے! اس کے ساتھ ابو حیان کی ذکر کردہ اس روایت کا اضافہ کیجیے جس کی رو سے ابن عباس رضی اللہ عنہما نے (اَشْتَرَوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ثَمَنًا قَلِيلًا فَصَدُّوا عَن سَبِيلِهِ) کی تاویل یہ بیان فرمائی ہے:"هم اهل الطائف، كانوا يمدون الناس بالاموال يمنعونهم من الدخول فى الاسلام، فصدوا عن سبيله، اى: صرفوا انفسهم عن دين الله و عدلوا عنه." (یہ اہلِ طائف تھے جو لوگوں کو مال دے کر انھیں اسلام میں داخل ہونے سے روکتے تھے۔ اس طرح انھوں نے اللہ کی راہ سے روکا، یعنی اپنے آپ کو اللہ کے دین سے پھیر لیا اور اس سے منہ موڑ لیا۔)(۸۱)

کیا اس سے زیادہ کسی تصریح کی ضرورت ہے؟

مسلمانوں کا ردعمل

اس موقع پر مسلمانوں نے اگر ذرا بھی کمزوری دکھائی ہوتی تو مشرکینِ عرب یقیناً counter revolution میں کامیاب ہو جاتے۔ چناں چہ اس موقع پر سورۃ التوبۃ کی آیات ۱۳ تا ۲۸ کا نزول ہوا جن میں مسلمانوں کو ان لوگوں سے بھرپور طریقے سے جنگ کا حکم دیا گیا:

۸۰– الطبری، **جامع**، ۱۴: ۱۴۳۔

۸۱– ابوحیان، **البحر المحیط**، ۵: ۱۶۔

M أَلَا تُقَٰتِلُونَ قَوۡمٗا نَّكَثُوٓاْ أَيۡمَٰنَهُمۡ وَهَمُّواْ بِإِخۡرَاجِ ٱلرَّسُولِ وَهُم بَدَءُوكُمۡ أَوَّلَ

$ # " ! Ä Ã Â Á À ¿ ¾ ½ » 1

2 1 / . - , + *) (' & %

(سورۃالتوبۃ آیات ۱۳ – ۱۵) L : 9 8 7 5 4 3

کیا تم نہیں لڑوگے ان لوگوں سے جنھوں نے اپنے عہد توڑ دیے ہیں اور رسول کو نکالنے کا ارادہ کیا اور تمھارے خلاف جنگ کی ابتدا بھی انھی لوگوں نے کی؟ کیا تم ان سے ڈرتے ہو؟ پس اللہ اس کا زیادہ مستحق ہے کہ تم اس سے ڈرو، اگر تم مومن ہو۔ لڑو ان سے تاکہ اللہ تعالیٰ تمھارے ہاتھوں سے ان کو عذاب دے دے اور انھیں ذلیل وخوار کردے اور ان کے خلاف تمھاری مدد کردے اور مومنوں کے دل ٹھنڈے کردے اور ان کے دلوں کا غصہ نکال دے۔ اور اللہ جسے چاہے اس پر رحم کرکے اسے توبہ کی توفیق دیتا ہے۔ اور اللہ علم والا حکمت والا ہے۔

آگے جتنی بھی آیات ہیں وہ اس سارے پس منظر کے مطابق بالکل اس موقع کی مناسبت سے نہایت بر محل تھیں۔ چناں چہ ایک طرف انھیں آگاہ کیا گیا کہ اللہ تعالیٰ ان کے ایمان کی آزمائش ضرور کرے گا تاکہ آشکارا کردے کہ کون ہیں جو اللہ تعالیٰ، اس کے رسول اور مومنوں کو چھوڑ کر دوسروں کو دوست بنانے والے نہیں ہیں۔[۸۲] اس کے بعد ان کفر کے پیشواوں کے اس زعم پر کاری ضرب لگائی کہ وہ مسجد حرام کو آباد کیے ہوئے ہیں اور حاجیوں کی خدمت کرتے ہیں اور اسی لیے وہ کعبے کی تولیت کے مستحق ہیں۔ واضح کیا گیا کہ مشرکین جو خود اپنے کفر پر گواہ ہیں، اللہ کے گھر کی تولیت کے اہل نہیں ہیں، بلکہ اہلِ ایمان ہی، جنھوں نے اللہ کے دین کی خاطر گھر بار چھوڑا اور جان اور مال کی قربانی سے دریغ نہیں کیا، اس کی تولیت کا استحقاق رکھتے ہیں۔[۸۳] اس کے بعد مومنوں کو خبردار کیا ہے کہ ان مشرکین کی دوستی وسرپرستی چھوڑ دیں ورنہ ان کا دعواے ایمان قابلِ قبول نہیں ہوگا۔[۸۴] پھر صریح الفاظ میں حکم دیا گیا کہ مشرکین کو مسجد حرام کے قریب پھٹکنے نہ دینا اور ساتھ ہی بتایا گیا کہ اللہ تعالیٰ کے

۸۲- القرآن ۹: ۱۶۔

۸۳- القرآن ۹: ۱۷-۲۲۔

۸۴- القرآن ۹: ۲۳-۲۷۔

علم و حکمت پر بھروسا کرتے ہوئے یہ اندیشہ خاطر میں نہ لاؤ کہ اس طرح تمھیں مادی نقصان اٹھانا پڑے گا۔ (۸۵)
آخر میں اس اعلانِ براءت اور تطہیر کی تکمیل کے لیے نسیء کی بدعت کے خاتمے کا بھی اعلان کیا۔ (۸۶)

مسلمانوں کی جانب سے بھرپور رد عمل نے ہی counter-revolution کی یہ سازش ناکام بنادی۔ چناں چہ کئی تفسیری روایات میں مذکور ہے کہ ان آیات میں مذکور لوگوں نے جنگ کی نوبت ہی نہیں آئی: "ما قوتل اهل هذه الآية بعد."(اس آیت میں مذکور لوگوں سے لڑائی کی نوبت ہی نہیں آئی۔)(۸۷) اس کی وضاحت اس روایت سے بھی ہوتی ہے جس میں اعلانِ براءت پر مشرکین کا رد عمل ذکر کیا گیا ہے۔ امام طبری نے اس روایت میں یہ اہم اضافہ نقل کیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس جذباتی رد عمل اور بلند بانگ دعووں کے بعد کیوں وہ پھر میدانِ جنگ میں مقابلے کے لیے نہیں آسکے؟ "فرجع المشركون، فلام بعضهم بعضاً، و قالوا: ما تصنعون و قد اسلمت قريش؟! فاسلموا."(پس مشرکین واپس گئے تو انھوں نے ایک دوسرے کو ملامت کی اور کہا کہ یہ تم کیا کر رہے ہو جب کہ قریش بھی مسلمان ہوگئے ہیں؟! پس وہ بھی مسلمان ہوگئے۔)(۸۸)

اس ساری بحث کی روشنی میں یہ معلوم ہوا کہ آیت ۱۳ میں "إِخْرَاجِ ٱلرَّسُول" کا اشارہ قریش کی اس سازش کی طرف نہیں ہے جو انھوں نے رسول اللہ ﷺ کی دعوت کے مکی دور میں کی تھی۔ اس سازش کا ذکر سورۃ الانفال میں ان الفاظ میں آیا ہے: M ` a b c d e f g h i | (سورۃ الانفال، آیت ۳۰) L k l m o p q (اور وہ وقت یاد کرو جب کفر کرنے

۸۵- القرآن ۹: ۲۸۔

۸۶- القرآن ۹: ۳۶ – ۳۷۔ بیچ میں آیات ۲۹ تا ۳۵ میں اہلِ کتاب سے اعلانِ براءت کی آیات رکھی گئی ہیں جن کا نزول غزوۂ تبوک سے قبل ہوا۔ ان آیات کے زمانۂ نزول اور آیات کی اس ترتیب میں کارفرما حکمت پر ہم ایک دوسرے مقالے میں تفصیلی بحث کر چکے ہیں جو ابھی منتظرِ طبع ہے۔

۸۷- الطبری، **جامع**، ۱۴: ۱۵۴-۱۵۶۔

۸۸- نفسِ مصدر، ۱۰۹۔

والے تمھارے خلاف سازش کر رہے تھے کہ تمھیں قید کر دیں یا قتل کر دیں یا جلاوطن کر دیں۔ وہ سازش کر رہے تھے اور اللہ بھی خفیہ تدبیر کر رہا تھا اور اللہ ہی سب سے بہتر تدبیر کرنے والا ہے۔)

یہاں صاف معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے مکہ سے نکالنے کو آخری آپشن کے طور پر رکھا تھا ورنہ اصلاً وہ نظر بند یا قتل کرنے کے درپے تھے۔ اس کے برعکس سورۃ التوبۃ کی زیر بحث آیت میں اخراج کی "خواہش" ہی کو ان کا جرم قرار دیا گیا ہے۔ بعض مفسرین نے اسے یہاں یہود کی کسی سازش کی طرف اشارہ سمجھا ہے لیکن علامہ آلوسی نے اس موقف پر کیا ہی خوب تنقید کی ہے: "و لا یخفی انه یاباه السیاق و عدم القرینة علیه." (یہ بات آشکارا ہے کہ سیاق اس تاویل سے انکاری ہے اور اس پر کوئی قرینہ نہیں ہے۔) [۸۹] اگر آیات کے سیاق کو اور اس ماحول کو جس میں ان کا نزول ہوا، دیکھا جائے تو یہاں ان کی counter-revolution کی اس کوشش کی طرف اشارہ ہے جس کا ذکر اوپر گزرا ہے۔ اسی طرح وَهُم بَدَءُوكُمْ أَوَّلَ مَرَّةٍ کا اشارہ غزوۂ بدر کی طرف نہیں، بلکہ فتح مکہ اور غزوۂ تبوک کے بعد ان کے نقضِ عہد اور پھر عام مشرکین سے سیدنا علی کرم اللہ وجہہ کے اعلان براءت کے بعد ان لوگوں کی جانب سے اعلانِ جنگ کی طرف ہے جس کا اوپر ذکر گزرا۔

اس حکم پر عمل کب ہوا؟

اس ساری بحث کے اختتام پر ایک نہایت اہم بات یہ ہے کہ اعلانِ براءت کے بعد مشرکین کے کسی گروہ کے خلاف عملی اقدام کی نوبت رسول اللہ ﷺ کی حیات مبارکہ میں نہیں آئی کیوں کہ مہلت کے اختتام سے قبل ہی ان سب نے—کم از کم بہ ظاہر—اسلام قبول کر لیا تھا۔ [۹۰] آیت ۵ اور آیت ۱۱ میں ان لوگوں کی جان و مال کی عصمت کے لیے ان آیات نے تین شرطیں رکھی ہیں:

۸۹— الوسی، **روح**، ۱۰ : ۶۱؛ خود علامہ آلوسی نے اسی عام رائے کو قبول کیا ہے کہ یہاں اشارہ ہجرت سے قبل قریش کی اس سازش کی طرف ہے جو انھوں نے دار الندوہ میں کی تھی اور جس کا ذکر اوپر سورۃ الانفال کی آیات کے حوالے سے گزرا۔ پھر اس پر خود یہ اعتراض نقل کیا ہے کہ ان کا اصل مقصد تو اخراج نہیں تھا۔ اس کے بعد اس اعتراض کا جو جواب نقل کیا ہے اس کی کمزوری واضح ہے۔

۹۰— سورۃ التوبہ کی تفسیر میں مفسرین نے ابن عباس رضی اللہ عنہما کی یہ بات نقل کی ہے کہ مشرکین کو چار مہینوں کی مہلت دی گئی کہ وہ اسلام قبول کرنے یا جزیرۂ عرب چھوڑ دینے میں کسی بات کو اختیار کر لیں لیکن مہلت کے اختتام سے قبل ہی وہ مسلمان ہو گئے۔ (الطبری، **جامع**، ۱۴: ۱۴۳) یہ بات اپنی جگہ نہایت اہم ہے کہ جو حکم بہ ظاہر اتنا سخت لگتا ہے اس کے عملی نفاذ کی

- یہ شرک سے توبہ کرلیں؛
- نماز قائم کریں؛ اور
- زکاۃ ادا کریں۔[۹۱]

فَإِن تَابُواْ وَأَقَامُواْ ٱلصَّلَوٰةَ وَءَاتَوُاْ ٱلزَّكَوٰةَ فَخَلُّواْ سَبِيلَهُم إِنَّ ٱللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيم (پھر اگر یہ شرک سے باز آئیں، اور نماز قائم کریں، اور زکاۃ ادا کریں، تب ان کی راہ چھوڑ دو۔ بے شک اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔)

رسول اللہ ﷺ نے اسی کی وضاحت میں فرمایا تھا: "أمرت ان أقاتل الناس حتى يشهدوا أن لا اله الا الله و أن محمداً رسول الله، و أقاموا الصلوة و آتوا الزكوة. فاذا فعلوها عصموا منى دمآءهم و أموالهم، و حسابهم على الله."[۹۲] (مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں ان لوگوں سے لڑوں یہاں تک کہ یہ گواہی دیں کہ اللہ کے سوا کوئی خدا نہیں ہے اور یہ کہ محمد اللہ کے رسول ہیں؛ اور نماز قائم کریں اور زکاۃ ادا کریں۔ پس جب وہ یہ کام کرلیں گے تو اپنی جانیں اور اپنے اموال مجھ سے بچالیں گے، اور ان کے حساب کا معاملہ اللہ کے سپرد ہے۔)

اس حدیث کے آخری ٹکڑے سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس موقع پر اسلام قبول کرنے والے کئی لوگوں کا دعوائے ایمان خواہ مشتبہ ہو لیکن جب وہ بہ ظاہر توحید اور رسالت کا اقرار کرلیتے اور نماز قائم کرنے اور

نوبت ہی نہیں آئی۔ تاہم رسول اللہ ﷺ کی وفات کے بعد جب عرب قبائل میں سے بعض نے ارتداد کی روش اختیار کی اور بعض نے زکاۃ کی ادائیگی سے انکار کیا تو ان کے خلاف سیدنا ابو بکر رضی اللہ عنہ نے جنگ کا اعلان کیا اور اس کے لیے سورۃ التوبہ کی انھی آیات سے استدلال کیا تھا۔ (تفصیل کے لیے دیکھیے: الجصاص، **أحكام**، ۴: ۲۷۰- ۲۷۱۔)

۹۱- اس مقام پر مفسرین تارکِ صلاۃ اور مانعِ زکاۃ کی شرعی حیثیت پر بھی بحث کرتے ہیں لیکن یہ بحث اس مقالے کی حدود سے باہر ہے۔

۹۲- ابو عبد اللہ محمد بن اسماعیل البخاری، **الجامع الصحیح**، کتاب الإیمان، باب قوله تعالیٰ: فَإِن تَابُواْ وَأَقَامُواْ ٱلصَّلَوٰةَ وَءَاتَوُاْ ٱلزَّكَوٰةَ ۔ ایک روایت میں أقاتل الناس کی جگہ أقاتل المشرکین کے الفاظ آئے ہیں: ابو عبد الرحمان احمد بن علی النسائی، **السنن** ، کتاب المحاربة، باب تحریم الدم۔

زکاۃ ادا کرنے کی ذمہ داری قبول کر لیتے تو رسول اللہ ﷺ ان کے اس ظاہری طرزِ عمل کو قبول فرما لیتے اور ان کے حساب کا معاملہ اللہ تعالیٰ کے حوالے کر دیتے۔

البتہ جب رسول اللہ ﷺ کا وصال ہوا تو اس وقت وہی صورتِ حال پھر پیدا ہو گئی جو غزوۂ تبوک کے موقع پر تھی۔ چناں چہ ایک طرف مسلمانوں کو روم کی سلطنت سے لڑائی درپیش تھی اور سیدنا اسامہ بن زید رضی اللہ عنہما کی سربراہی میں لشکر مدینہ منورہ سے شام کی طرف روانہ ہونے کو تھا۔ دوسری طرف جاہلیت کے علم برداروں کو پھر سر اٹھانے کا موقع ملا اور چند مخصوص قبائل میں ارتداد کی آگ بڑی تیزی سے پھیل گئی۔ بعض صحابۂ کرام نے موقع کی نزاکت کی وجہ سے جیشِ اسامہ کی روانگی موخر کرنے کا مشورہ دیا جسے سیدنا ابو بکر رضی اللہ عنہ نے اس بنیاد پر قبول کرنے سے انکار کیا کہ جو لشکر رسول اللہ ﷺ نے روانہ فرمایا تھا، اسے میں کیسے روک سکتا ہوں؟ اسی طرح بعض صحابۂ کرام کی رائے یہ تھی کہ مانعینِ زکاۃ سے فی الحال صرفِ نظر کیا جائے کیوں کہ وہ اسلام سے انکاری نہیں تھے۔ تاہم ان کے خلاف جنگ کے لیے سیدنا ابو بکر رضی اللہ عنہ نے ان آیات اور رسول اللہ ﷺ کے اس ارشاد سے یہی استدلال کیا تھا کہ ان لوگوں کو جن شرائط کے ماننے کی وجہ سے جنگی اقدام سے قانونی تحفظ حاصل ہو گیا تھا، ان میں سے کسی ایک شرط کے نہ ماننے سے بھی وہ قانونی تحفظ ختم ہو جاتا ہے اور ان کے خلاف جنگی اقدام کیا جائے گا۔[۹۳] اس طرح نہ صرف یہ کہ سیدنا ابو بکر رضی اللہ عنہ نے خود کو واقعتاً رسول اللہ ﷺ کا جانشین ثابت کیا، بلکہ آپ کے اس مضبوط کردار اور ثابت قدمی نے ہی اس فتنے کا خاتمہ کیا ورنہ اس موقع پر اگر معمولی مداہنت کا بھی مظاہرہ کرتے یا نص کے مقابلے میں مزعومہ مصلحت کا خیال خاطر میں لاتے تو اسلام اور مسلمانوں کو وہ ناقابلِ تلافی نقصان ہوتا جس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔

اس موضوع پر تفصیلی بحث ہم کسی اور وقت کے لیے اٹھا رکھتے ہیں۔ سر دست صرف اس بات کی طرف توجہ دلانا تھی کہ مشرکینِ عرب کے خلاف اعلانِ براءت کے بعد جنگ کے حکم پر عمل سیدنا ابو بکر رضی اللہ عنہ کے دور میں ہوا۔

و اللہ تعالیٰ أعلم، و علمه أتم و أحكم.

۹۳- تفصیل کے لیے دیکھیے: الجصاص، **أحكام**، ۴: ۲۷۰-۲۷۱۔

نتائجِ بحث

اس مقالے میں کی گئی تفصیلی بحث سے سورۃ التوبۃ کے اس ابتدائی حصے کے زمانۂ نزول کے متعلق یہ بات یقینی طور پر معلوم ہوتی ہے کہ اس حصے کا نزول ۹ھ میں ہی ہوا ہے، جیسا کہ عام طور پر مفسرین کا موقف ہے۔ البتہ اس ضمن میں مندرجہ ذیل نکات اہم ہیں:

۱. پہلی ۱۲ آیات ۱۲ کا نزول غزوۂ تبوک سے واپسی کے بعد ہوا اور سیدنا علی کرم اللہ وجہہ نے حج کے موقع پر اعلانِ براءت کے لیے انھی آیات کی تلاوت فرمائی۔

۲. اس اعلان کے بعد جب مشرکین کے سرداروں کی جانب سے فیصلہ کن جنگ کی دھمکی دی گئی تو اس کے بعد آیات ۱۳ تا ۲۸ اور ۳۶-۳۷، کا نزول ہوا جن میں مسلمانوں کو مشرکین کے ساتھ آخری جنگ کے لیے حتمی احکام دیے گئے اور ان کے ساتھ کسی قسم کی نرمی کی گنجایش نہیں چھوڑی گئی۔ اس بھرپور ردعمل نے مشرکین کو جنگ سے پہلے ہی پسپا کر دیا اور مہلت کی مدت ختم ہونے سے پہلے ہی ان کی اکثریت نے اسلام قبول کر لیا جب کہ بعض جزیرۂ عرب سے ہی نکل گئے۔

۳. فتحِ مکہ بعد مشرکینِ مکہ اور عام مشرکینِ عرب کو عارضی امان دی گئی جس کی رو سے ان کے لیے عارضی طور پر بیت اللہ الحرام میں آمد کا حق مان لیا گیا تھا۔ تاہم مشرکین کو معلوم تھا کہ حتمی فیصلے کا اعلان کسی بھی وقت ہو سکتا ہے۔ چناں چہ جب بالخصوص غزوۂ تبوک کے موقع پر مشرکین نے مسلمانوں اور اسلام کے خاتمے کے لیے منصوبے بنائے اور ان کی جانب سے عہد شکنی کا سلسلہ دراز ہوا اور، تو اس عہدِ عام کے خاتمے کا اعلان کیا گیا۔ البتہ اعلانِ براءت کے باوجود ان کو فوری طور پر سزا دینے کے بجاے انھیں چار مہینے کی آخری مہلت دی گئی۔

۴. پہلی چھے آیات میں اعلانِ براءت کے بعد آیات ۷ تا ۱۲ میں اعلانِ براءت کی حکمت اور وجوہات ذکر کی گئیں۔ یہاں آیت ۷ میں مسجد حرام کے ساتھ کیے گئے معاہدے سے مراد فتحِ مکہ کے موقع پر قریش کو دی گئی امان ہے۔ فتحِ مکہ کے بعد اگرچہ قریش کے اکثر لوگوں کے اسلام قبول کیا تاہم بعض شرک پر قائم رہے اور ان مشرکین میں بعض نے بہ ظاہر امان کی پابندی کی لیکن بعض ایسے بھی تھے جو موقع کی تلاش میں تھے اور اہلِ طائف اور دیگر

مشرکین کے ساتھ مل کر تاریخ کا پہیہ الٹا چلانا چاہتے تھے۔ اسی موخر الذکر گروہ کے بارے میں مسلمانوں کو آگاہ کیا گیا کہ اگر وہ تم پر غالب آنے کا امکان دیکھ لیں تو رشتے کا لحاظ کریں گے نہ ہی معاہدے کا۔ آگے آیت ۱۲ میں انھی لوگوں کے کفر کے پیشوا قرار دیا گیا کیوں کہ وہ اس وقت نظامِ جاہلیت کی بقا کے لیے سرگرم تھے۔

۵. اعلانِ براءت پر کفر کے ان پیشواؤں کے ردعمل نے قرآن کی پیش گوئی سچی کر دکھائی۔ چناں چہ اس کے بعد نازل ہونے والی آیات میں مسلمانوں کو ان لوگوں سے بھرپور جنگ کا حکم دیا گیا۔ اس سیاق میں جب آیت ۱۳ میں رسول اللہ ﷺ کے نکالنے کے ارادے کا ذکر ہوا تو اس سے مراد مکہ سے رسول اللہ ﷺ کی ہجرت کا وقت نہیں ہے بلکہ مراد فتحِ مکہ اور اعلانِ براءت کے بعد ان کفر کے پیشواؤں کی جانب سے counter-revolution کی کوشش ہے۔ اسی طرح اس آیت میں جب یہ ذکر کیا گیا کہ جنگ کا آغاز بھی ان لوگوں نے کیا ہے تو اس سے مراد ماضیِ بعید میں مشرکین کی جانب سے جنگ کے سلسلے کا آغاز نہیں ہے بلکہ ماضیِ قریب میں غزوۂ تبوک کے موقع پر ان کی جانب سے مسلمانوں اور اسلام کے خلاف کی جانے والی وہ سازشیں ہیں جو انھوں نے امن معاہدے کے باوجود کیں۔

هذا ما عندي، و العلم عند الله !

❁❁❁❁❁❁